اکتوبر ۸۵

تدبّر

زیرِ نگرانی

مولانا امین احسن اصلاحی

یکے از مطبوعات

ادارہ تدبّرِ قرآن و حدیث

رحمان سٹریٹ مسلم کالونی سمن آباد، لاہور

قیمت تین روپے

مجلس ترتیب

خالد مسعود (مدیر)
جاوید احمد
عبداللہ غلام احمد
ماجد خاور

ناشر: ادارۂ تدبر قرآن وحدیث
مطبع: المطبعۃ العربیہ پرانی انارکلی لاہور

تدبّر

سلسلہ نمبر ۵ | محرم ۱۴۰۳ھ | اکتوبر ۱۹۸۲ء

فہرست مضامین

تذکرہ و تبصرہ

اصلاحِ معاشرہ ــــــ خالد مسعود ۳

تدبر قرآن

سورہ بقرہ (۵) ــــــ خالد مسعود ۸

فہم قرآن کے چند بنیادی اصول ــــــ امین احسن اصلاحی / عبداللہ غلام احمد ۱۳

تدبر حدیث

صحابہ اور صحابیت ــــــ امین احسن اصلاحی / ماجد خاور ۱۷

ارادہ اور عمل کا صلہ ــــــ خالد مسعود ۲۵

تزکیہ نفس

تعلق باللہ اور اس کی اساسات ــــــ امین احسن اصلاحی ۳۴

مراسلہ و مذاکرہ

کیا اسلام صلح و آشتی کا مذہب ہے؟ ــــــ امین احسن اصلاحی / ماجد خاور ۴۶

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تذکرہ و تبصرہ

خالد مسعود

اصلاحِ معاشرہ

معاشرہ کسی قوم کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس کی قوت اور درستی پر قوم کے وجود، استحکام اور بقاء کا انحصار ہے۔ معاشرہ کے بناؤ اور بگاڑ سے قوم براہِ راست متاثر ہوتی ہے۔ معاشرہ اصلاح پذیر ہو تو اس سے ایک قومی، صحت مند، اور باصلاحیت قوم وجود میں آتی ہے اور اگر معاشرہ بگڑا ہوا ہو تو اس کا فساد قوم کو گھن کی طرح کھا جاتا ہے۔

معاشرے کا کردار بننے یا بگڑنے کا عمل فی الفور مکمل نہیں ہو جاتا بلکہ اس میں طویل مدت صرف ہوتی ہے۔ بگاڑ کی راہ پر چلنے والے معاشرہ میں اچھی اقدار ایک ایک کر کے منہدم ہوتی چلی جاتی ہیں۔ نیک و بد کے بارے میں شدید احساس رکھنے والے لوگ تو اس خرابی کو جلد بھانپ جاتے ہیں لیکن عام لوگوں پر یہ مدتوں کے بعد کھلتی ہے۔ اسی طرح معاشرہ کی اصلاح کا کام بھی ہے۔ جس طرح ایک بنیاد اٹھا کر اس پر ایک ایک اینٹ جوڑنے سے دیوار مکمل ہوتی ہے اسی طرح اصلاح کا کام بھی ایک تعمیری منصوبہ بندی چاہتا ہے۔ جب یہ کام منصوبہ بندی کے بغیر کیا جاتے تو اس کی کامیابی محلِ نظر ہوتی ہے۔

قرآنِ مجید نے قوموں کے عروج و زوال کی جو تاریخ بیان کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قومیں جب بھی خدا اور آخرت کے تصور سے بے نیاز ہوتی ہیں یا ان کا یہ تصور ناقص ہوا ہے اور ان میں اخلاقی مفاسد سرایت کر گئے ہیں تو اگر قوم میں اصلاحِ احوال کا جذبہ پیدا نہیں ہوا تو وہ ہمیشہ برباد ہو گئی ہے۔ اس کی تباہی میں اس سوال کو کبھی کوئی اہمیت نہیں رہی کہ اس کے فساد کی نوعیت کیا ہے بلکہ ہر بڑا عمل خواہ اسکی نوعیت اس تکبر کی رہی ہو جو عاد اور ثمود میں تھا، اس اخلاقی گراوٹ کی رہی ہو جو قومِ لوط میں پائی جاتی تھی یا اس تاجرانہ بداخلاقی اور بددیانتی کی ہو جس کا مظاہرہ قومِ شعیب نے کیا، جب بھی وہ معاشرہ کا اجتماعی کردار بن گیا تو اس کی موت کا پیغام لے آیا۔ قرآنِ مجید کے اس فلسفہ کی رو سے ایک قوم کے برومند

ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ معاشرہ کے اندر خدا کا خوف اور اس کے ساتھ صحیح بنیادوں پر تعلق پایا جائے۔ دلوں میں آخرت کے محاسبہ کا اندیشہ موجود ہو اور کسی بھی قسم کے فسادِ اعمال کو معاشرہ پر مسلط ہونے کا موقع نہ دیا جائے۔ یہ مقصد ظاہر ہے کہ صرف اس صورت میں حاصل ہو سکتا ہے جب قوم کے اندر اصلاحِ معاشرہ کیلئے ایک مسلسل جد و جہد کی جاتی رہے۔ اور کسی بھی فساد کے معاملے میں چشم پوشی سے کام لے کر اسے قوم کے اجتماعی وجود میں راہ پانے کا موقع نہ دیا جائے۔

معاشرہ کے اندر جب فساد راہ پاجاتا ہے تو اس کا ظہور نہ تو کسی ایک ہی شکل میں ہوتا اور نہ کسی ایک ہی طبقہ تک محدود رہتا ہے۔ بلکہ ہر شعبۂ زندگی اور قوم کا ہر طبقہ اس سے متاثر ہوتا ہے۔ قوم کے سنجیدہ عناصر جب اصلاحِ احوال کے لئے فکر مند ہوتے ہیں تو متنوع مفاسد پر گرفت کے لئے انہیں کوئی طریقہ سجھائی نہیں دیتا۔ وہ خرابی کی ہمہ گیری کو دیکھتے ہوئے اشتہار بازی کا سہارا لیتے ہیں اور اس طرح دِل کو تسلی دیتے ہیں کہ انہوں نے قوم کی اصلاح کا حق ادا کر دیا۔ با اختیار طبقہ اخلاقی فساد کا علاج نگران ادارے قائم کر کے کرنا چاہتا ہے۔ رشوت ستانی کو فروغ پاتے دیکھتا ہے تو اس کے انسداد کا محکمہ بنا دیتا ہے۔ ملاوٹ اور چور بازاری کی وبا کو دیکھتا ہے تو چھاپہ مار عملہ ترتیب دیکر اس پر قابو پانا چاہتا ہے۔ حکومت کے کارکنوں میں بدعنوانی کی گرم بازاری دیکھتا ہے۔ تو قواعد و ضوابط میں ترامیم کا سہارا لیتا ہے۔ اصلاحی کمیٹیاں قائم کی جاتی ہیں کہ وہ اس ہمہ گیر فساد پر قابو پانے کے لئے سفارشات پیش کریں۔ اس ساری سرگرمی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زندگی کے ہر دائرے میں ادارے اور تنظیمیں تو قائم ہوتی چلی جاتی ہیں لیکن بات جہاں تھی وہیں رہتی ہے۔ بلکہ مفاسد نت نئی شکل اختیار کرتے سامنے آتے ہیں اور معاشرہ میں مزید پیچیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تمام نگران اداروں اور تنظیموں کا عملہ اسی مفسد معاشرہ سے آتا ہے۔ وہ نہایت آسانی سے خود انہی خرابیوں کا شکار ہو جاتا ہے جن کی روک تھام کے لئے اس کا تقرر کیا گیا تھا۔

ہمارے نزدیک کسی بھی بیماری کا صحیح علاج صرف اس وقت ممکن ہوتا ہے جب اس کے اسباب کا صحیح طور پر تعین کر لیا جائے۔ معاشرہ کے فساد کے اسباب کے تعین میں بالعموم غلطی کی جاتی ہے۔ کوئی جرم یا گناہ بلا وجہ صادر نہیں ہوتا بلکہ اس کے مرتکب کے دِل میں خداوند تعالیٰ کے ساتھ تعلق کی کمی، تصورِ آخرت کے شعور میں غلطی اور دنیا کی محبت اس کا سبب بنتی ہے۔ یہ بنیادی سبب

پایا جاتے۔ تو پھر ہر شعبۂ زندگی میں فساد کی اقسام کی کوئی انتہا نہیں ہوتی۔ انسانی ذہن بڑا زرخیز ہے۔ وہ ایک سے ایک بڑھ کر جرائم کی انوکھی اور نت نئی شکلیں اختیار کر لیتا ہے۔ لہٰذا جب تک لوگوں کی تربیت اس نہج پر کرنے کا انتظام نہ کیا جائے کہ وہ خدا کے ساتھ اپنے تعلق کو سمجھنے کے قابل ہو جائیں۔ دنیا کے بارے میں ان کا تصور ذمہ دارانہ ہو جائے اور وہ یہ شدید احساس رکھتے ہوں کہ آخرت میں ان کے تمام اعمال کی بازپرس ہونے والی ہے۔ جس کا نتیجہ ابدی عذاب کی صورت میں بھی نکل سکتا ہے، لہٰذا ان کی فلاح اچھے کردار کو اپنانے ہی سے وابستہ ہے اس وقت تک ان کی اصلاح کی توقع رکھنا عبث ہے۔

صحیح بنیاد پر اصلاحِ معاشرہ کا بیڑہ اٹھایا جائے تو اس کی طرف پہلا قدم ایک فرد کی اصلاح کرنا ہوگا یعنی معاشرہ کے ہر فرد کے ذہن میں ان حقائق کو راسخ کیا جائے جن کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے۔ صحیح علم ہی سے صحیح عمل پیدا ہو سکتا ہے۔ اس لئے موت و حیات کے اصل حقائق کے راسخ علم سے فرد کے اندر تقویٰ، پرہیزگاری، خشیتِ الٰہی اور خوفِ آخرت پیدا ہوگا۔ ایک فرد کے دِل کا یہ نور اس کے اخلاق و کردار کے تمام گوشوں کو روشن کر دے گا اور آپ سے آپ اس کی عملی اصلاح کے آثار پیدا ہو جائیں گے

ایک فرد کے اندر کا یہ نور اس کی ذات تک محدود نہیں رہتا بلکہ اس سے اس کا قریبی ماحول اور کنبہ مستفیض ہوتا ہے۔ ایسا فرد اپنے بیوی بچوں اور متعلقین کو گمراہی میں نہیں دیکھ سکتا۔ اسے اس ذمہ داری کا احساس ہوتا ہے کہ اسے ایک گلے کی نگرانی کا کام سونپا گیا ہے۔ اگر گلے کی ایک بھیڑ بھی ریوڑ سے کٹ کر بھٹک جائے گی تو اس کا مالک اس کی نالائقی پر ناراض ہوگا۔ لہٰذا ایسا شخص اپنے زیرِ اثر لوگوں کی فکری و اخلاقی اصلاح کے لئے ہر وقت کوشاں رہتا ہے۔ اس کا یہ عمل معاشرہ کی اصلاح کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔

اہلِ دنیا کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ پورے کا پورا معاشرہ غیر ذمہ دار اور خدا اور آخرت سے بے نیاز ہو جائے اور ان کو ٹوکنے والا اور برا سمجھنے والا کوئی نہ رہے۔ اس کے برعکس اہلِ دین کو یہ ذمہ داری بتائی گئی ہے کہ وہ اپنے اپنے حلقۂ اثر میں برائی کے نفوذ کی مزاحمت کریں اور لوگوں میں نیکی اور بھلائی کو رواج دینے کی مثبت کوشش کریں۔ اس سلسلے میں جو شخص جتنا بااثر ہوتا ہے اس کی ذمہ داری اسی قدر زیادہ بتائی گئی ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے جو شخص کسی کو برائی کرتا دیکھے تو وہ اگر بااثر ہو تو طاقت سے اس کا قلع قمع کر دے۔ اگر وہ

ایسا کرنے کی طاقت نہیں رکھتا تو اپنی زبان سے لوگوں کو قائل کرے کہ وہ اس برائی کو ترک کردیں اور نیکی اختیار کریں۔ اگر وہ برائی کے خلاف زبان کھولنے سے بھی معذور ہے، تو اس کے ایمان کا کم سے کم تقاضا یہ ہے کہ وہ اس برائی سے دل میں نفرت رکھے اور اس کی آلودگی سے اپنا دامن بچاتے رکھے۔ ایمان رکھتے ہوتے اس سے کمتر کسی کردار کا مظاہرہ کرنا کسی مسلمان کو زیب نہیں دیتا۔

اصلاحِ معاشرہ کی اس تحریک میں جو فرد کی اصلاح کو مقصد بناتے، ہر نیک آدمی اور ہر مذہبی وسماجی ادارہ حصہ لے سکتا ہے۔ دینی مدارس، سکول، کالج اور یونیورسٹیاں اس میں ممد ثابت ہوسکتی ہیں۔ صحیح الفکر سیاسی جماعتیں بھی یہ کام کرسکتی ہیں اور یہ تحریک معاشرے کے ایک مستقل پروگرام کے طور پر جاری رہ سکتی ہے۔ اس تحریک میں اربابِ حکومت کا یہ حصہ ہوتا ہے کہ وہ اصلاح کی تمام کوششوں کو تقویت دینے اور نتیجہ خیز بنانے کے لئے پالیسیاں بنائیں اور اس طرزِ فکر کی حوصلہ شکنی کریں جو اس کی راہ میں رکاوٹ بن رہا ہو۔ وہ ملک میں ایسا تعلیمی نظام رائج کریں جو اصل حقائق زندگی سے لوگوں کو روشناس کرا کر ان کو ذمہ دار شہری بناتے اور ان میں خوفِ خدا اور خوفِ آخرت پیدا کرے۔ ان لوگوں پر ان کی گرفت بڑی سخت ہو جو معاشرے میں فساد کا بیج بوئیں۔ وہ حکومت میں امر بالمعروف اور نہی عنِ المنکر کا ایک مستقل شعبہ قائم کریں جس کے پیشِ نظر مقصد ہی یہ ہو کہ وہ نیکیوں اور بھلائیوں کی طرف ترغیب دے اور برائیوں کو مٹانے کے لئے کمربستہ ہے۔ ان کا عدالتی نظام جرائم کی سزا جلد دینے کا قائل ہو اور مقدمات کو طول دے کر فیصلوں میں تاخیر نہ کرے۔

یہ تو ہے اصلاحِ معاشرہ کا اصل طویل المیعاد پروگرام جس سے مطلوبہ نتائج حاصل ہونے کی توقع ہوسکتی ہے لیکن امتِ مسلمہ کے اچھے حکمرانوں نے اپنے اوپر بعض پابندیاں عائد کرکے بھی اپنی رعایا کے لئے اچھی تربیت کا سامان فراہم کیا۔ عوام اپنے حکمرانوں کی تقلید کرنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں اور ان کی پسند معاشرے کا فیشن قرار پاتی ہے۔ چنانچہ خلفائے راشدین نے اپنا معیار زندگی ہمیشہ اتنا پست رکھا کہ ان میں اور ایک کم آمدنی والے کارکن کے معیارِ زندگی میں کوئی فرق ہوتا تھا ان کی نگاہ میں امیر اور غریب دونوں کو یکساں قدر و منزلت حاصل تھی۔ وہ جہاں دولت کا مظاہرہ دیکھتے فوراً اس کی حوصلہ شکنی کرتے۔ خلفائے راشدین کے اس طرزِ عمل کا نتیجہ یہ نکلا کہ کثرتِ مال معاشرے میں باعثِ عزت نہ تھی حصولِ زر زندگیوں کا مقصد نہ بنا اور امیر و غریب کے تفاوت نے معاشرتی بے انصافیوں کو جنم نہیں دیا۔

خلفائے راشدین کے دور کی دوسری بڑی خصوصیت قانون کا عادلانہ نفاذ تھا جس کے لئے وہ ہمیشہ مستعد رہتے تھے۔ وہ نفاذِ قانون میں نہ عمالِ حکومت کا لحاظ کرتے تھے اور نہ اپنے اعزہ و اقارب کا۔ درۂ عمرؓ کو جو شہرت حاصل ہوئی ہے وہ اس بناء پر نہیں کہ خدانخواستہ حضرت عمرؓ لوگوں کو اپنے منصبی تفوق اور اختیارات کا احساس دلانے کے لئے ان پر بار بار یہ درّہ برسایا کرتے تھے۔ بلکہ یہ شہرت اس بنا پہ ہے کہ یہ درہ اس وقت بلا تاخیر حرکت میں آجاتا تھا جب کوئی شخص قانون سے بے پروائی کا اظہار کرتا، کسی کمزور پر ظلم کرتا یا اخلاقی تربیت کے لئے اُسے تادیب کی ضرورت ہوتی۔ وہ حضرت عمرؓ کی فرض شناسی، بیدار مغزی، معدلت گستری اور قانون و اخلاق کی پاسداری کی ایک علامت تھا۔

ملک کے حکمرانوں کے اندر جب یہ صفات پیدا ہو جائیں تو ان کی رعایا کے لئے یہ قابلِ تقلید نمونہ بن جاتی ہیں۔ وہ جب دیکھتے ہیں کہ ان کے حکمران وسائل پر اختیار رکھتے ہوئے زندگی کی آسائشوں سے اپنے آپ کو محروم رکھے ہوئے ہیں۔ وہ دولت سمیٹنے کی کوئی آرزو نہیں رکھتے، محض امارت باعثِ عزت تصور نہیں کی جاتی۔ قانون و اخلاق کی بالادستی قائم رکھی جاتی ہے۔ اور عدل و انصاف کے تقاضوں سے حکمران اپنی ذات کو بھی مستثنیٰ قرار نہیں دیتے تو یہی رسم حکومت کے اہل کاروں اور عوام میں بھی چل پڑتی ہے۔

اربابِ حکومت کے علاوہ معاشرے کے دوسرے سربرآوردہ لوگ، خواہ وہ سیاسی میدان سے تعلق رکھتے ہوں یا مذہبی، سماجی یا دوسرے طبقات سے، وہ بھی اپنے طرزِ عمل سے اپنے اپنے حلقۂ اثر میں پسندیدہ طرزِ زندگی کو رواج دینے کی طرح ڈال سکتے ہیں۔ بشرطیکہ وہ اپنے اوپر چند پابندیاں عاید کریں اور ایسے فلسفۂ زندگی کا پرچار کریں جس کے نتیجہ میں اخلاقی فساد کی راہیں مسدود کی جاسکتی ہوں۔ عوام الناس چونکہ بڑوں کے طریقہ سے فوراً متاثر ہوتے اور ان کی تقلید میں عزت محسوس کرتے ہیں۔ اس لئے اصلاح معاشرہ کے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے یہ طریقہ قلیل المیعاد اور نسبتاً آسان ہے۔

تدبر قرآن
خالد مسعود

سورہ بقرہ (۵)

اے بنی[۱۴۷] اسرائیل میرے اس فضل کو یاد کرو جو میں نے تم پر کیا اور اس بات کو کہ میں نے تمہیں اہل عالم پر فضیلت دی اور اس دن سے ڈرو جس دن کوئی جان کسی کے کچھ کام نہ آئے گی اور نہ اس سے کوئی معاوضہ قبول ہوگا نہ اس کو کوئی شفاعت نفع پہنچائے گی، اور نہ ان کی کوئی مدد ہی کی جا سکے گی ۞ ۱۲۳،

اور یاد کرو جب کہ ابراہیم کو اس کے رب نے چند باتوں میں آزمایا تو وہ اس نے پوری کر دکھائیں[۱۴۸]۔ فرمایا بیشک میں تمہیں لوگوں کا پیشوا بناؤں گا[۱۴۹]۔ اس نے پوچھا اور میری اولاد میں سے؟ فرمایا میرا یہ عہد ان لوگوں کو شامل نہیں ہے جو ظالم[۱۵۰] ہوں گے ۞ ۱۲۴

اور یاد کرو جب کہ ہم نے بیت اللہ کو لوگوں کے لئے مرکز اور امن کی جگہ بنایا اور حکم دیا کہ مقام[۱۵۱] ابراہیم میں ایک نماز کی جگہ بناؤ، اور ابراہیم اور اسماعیل کو ذمہ دار بنایا کہ میرے گھر کو طواف کرنے والوں، اعتکاف کرنے والوں اور

---

۱۴۷ یہاں سے آگے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے فرزندوں کی سرگزشت حیات کا وہ حصہ پیش کیا جا رہا ہے جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اور آپ کی رسالت کی تائید اور یہود و نصاریٰ اور مشرکین کے تمام دعاوی کی تردید ہو رہی ہے۔

۱۴۸ مراد اللہ تعالیٰ کے وہ احکام ہیں جو اس نے حضرت ابراہیم کے امتحان کے لئے ان کو دیئے اور انہوں نے بے چون و چرا ان کی تعمیل کی مثلاً انہوں نے بتکدے میں توحید کی اذان دی۔ ان کو دین آبائی کی توہین کے جرم میں آگ میں ڈالا گیا تو بے خطر اس میں کود پڑے۔ ہجرت کا حکم ہوا تو وہ ہجرت کر گئے۔ اکلوتے اور محبوب فرزند کی گردن پر چھری چلا دینے کا حکم ہوا تو انہوں نے بے دریغ اس بازی کے لئے بھی آستینیں چڑھا لیں۔

۱۴۹ یعنی حضرت ابراہیم کو جو منصب عطا ہوا وہ تمام تر صفات پر مبنی ہے۔ اس کو کوئی تعلق نسب اور خاندان سے نہیں۔

۱۵۰ یعنی ابراہیم کی وراثت میں ان لوگوں کا کوئی حصہ نہیں ہے جو شرک و کفر میں مبتلا ہیں۔

۱۵۱ مقام ابراہیم سے مراد حرم کا پورا علاقہ ہے جس کے ایک حصے میں نماز کی جگہ بنانے کا حکم ہوا جو ذریت ابراہیم کا مرکز اور قبلہ قرار پائے۔

رکوع سجدہ کرنے والوں کے لئے پاک رکھو[۱۵۲] ۞ ۱۲۵۔

اور یاد کرو جب کہ ابراہیم نے دعا کی کہ اے رب اس سرزمین کو امن کی سرزمین بنا اور اس کے باشندوں کو، جو ان میں سے اللہ اور روز آخرت پر ایمان لائیں پھلوں کی روزی عطا فرما[۱۵۳]۔ فرمایا جو کفر کریں گے میں انہیں بھی کچھ دن بہرہ مند ہونے کی مہلت دوں[۱۵۴] گا، پھر میں ان کو دوزخ کے عذاب کی طرف دھکیلوں گا اور وہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے ۞ ۱۲۶۔

اور یاد کرو جب کہ ابراہیم اور اسماعیل بیت اللہ کی بنیادیں اٹھا رہے تھے[۱۵۵] انہوں نے دعا کی کہ اے ہمارے رب ہماری جانب سے یہ دعا قبول فرما۔ بیشک تو سننے والا جاننے والا ہے۔ اے ہمارے رب ہم دونوں کو تو اپنا فرمانبردار بنا اور ہماری ذریت میں سے تو اپنی ایک فرمانبردار امت اٹھا۔ اور ہمیں ہمارے عبادت کے طریقے[۱۵۶] بتا اور ہماری توبہ قبول فرما۔ بے شک تو توبہ قبول کرنے والا رحم فرمانے والا ہے ۞ اور اے ہمارے رب تو ان میں انہی میں[۱۵۸] سے ایک رسول مبعوث فرما جو ان کو تیری آیتیں سنائے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے[۱۵۹]۔ بے شک تو غالب

---

۱۵۲ حکم ان ساری چیزوں سے پاک رکھنے کا ہوا جو اس گھر کے مقصد تعمیر کے منافی ہوں، عام اس سے کہ وہ گندگی و نجاست ہو یا لہو و لعب کے ہنگامے ہوں، یا اصنام و اوثان ہوں۔

۱۵۳ حرم کے علاقے کے دو مسئلے اس وقت اہم تھے۔ ایک امن کا دوسرا غذا کا۔ حضرت ابراہیمؑ کی دعا انہی دو چیزوں کے لئے تھی۔ ثمرات کا لفظ اجناس، غلہ جات اور میوہ جات سب کو محیط ہے۔

۱۵۴ یعنی جو لوگ خدا کے نافرمان ہوں گے وہ خدا کی خلافت کے سزاوار تو ہرگز نہیں لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ان کی نافرمانی کے سبب سے خدا ان کی روزی چھین لے۔

۱۵۵ اب یہ یاد دلایا جا رہا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسماعیلؑ کی اس گھر کے ساتھ کیا آرزوئیں اور تمنائیں وابستہ تھیں۔ اور مستقبل میں اس سے کس فیض عالمگیر کے جاری ہونے کی انہوں نے اپنے پروردگار سے دعا کی تھی۔

۱۵۶ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے انبیاء کی رہنمائی اراحوت کے ذریعے سے ہوتی تھی یعنی یا تو رویا میں ان کو ایک بات دکھا دی جاتی تھی، یا کوئی فرشتہ ظاہر ہو کر مطلوب کام کی طرف رہنمائی کر دیتا تھا۔ یہ دعا بھی اسی اراحوت کی ہے۔

۱۵۸ اس موقع پر حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ صرف حضرت اسماعیلؑ ہی تھے اس وجہ سے اس دعا کا تعلق لازماً انہی کی ذات سے تھا اس کا کوئی تعلق بھی حضرت اسحاقؑ کی ذریت سے نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ حضرت اسماعیلؑ کی نسل کے اندر آخری رسول محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور ہوا۔

۱۵۹ رسول لوگوں کو آسمان و زمین کے خالق و مالک کے احکام و فرامین اور اس کے خالق کے دلائل و براہین سے آگاہ کرتا ہے۔ وہ لوگوں کے دلوں اور ان کے اعمال و اخلاق کو پاک و صاف کرتا ہے اور ان کو نشو و نما دے کر ان میں مفاسد اور مخالف و مزاحم چیزوں کے مقابلہ کی قوت بھی پیدا کرتا ہے۔

اور حکمت والا ہے ۞ ۱۲۹۔

اور کون ہے جو ملتِ ابراہیم سے اعراض کرے، مگر وہی جو اپنے آپ کو حماقت میں مبتلا کرے[159]۔ ہم نے اس کو دنیا میں بھی برگزیدہ کیا اور آخرت میں بھی صالحین کے زمرہ میں ہوگا[160] ۞ جب کہ اس کے رب نے اس کو حکم دیا کہ اپنے آپ کو حوالہ کر دے[161] اس نے کہا کہ میں نے اپنے آپ کو پروردگارِ عالم کے حوالہ کیا۔ ۱۳۱۔

اور ابراہیم نے اسی ملت کی وصیت اپنے بیٹوں کو کی اور اسی کی وصیت یعقوب نے اپنے بیٹوں کو کی۔ اے میرے بیٹو! اللہ نے تمہارے لئے دینِ اسلام[162] کو پسند فرمایا، تو تم نہ مرنا مگر اسلام کی حالت پر ۞ ۱۳۲۔ کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوب کی موت کا وقت آیا۔ جبکہ اس نے اپنے بیٹوں سے پوچھا تم میرے بعد کس کی پرستش کروگے؟ وہ بولے ہم تیرے معبود اور تیرے آباؤ اجداد، ابراہیم، اسمٰعیل اور اسحٰق[163] کے معبود کی پرستش کریں گے، جو ایک ہی معبود ہے اور ہم اسی کے فرمانبردار ہیں ۞ ۱۳۳۔

یہ ایک گروہ تھا جو گزر چکا، اس کو ملے گا جو کچھ اس نے کیا اور تمہیں ملے گا جو کچھ تم نے کیا اور جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں اس کی بابت تم سے سوال نہیں ہوگا[164] ۞ ۱۳۴۔

۱۵۹۔ مطلب یہ ہے کہ ابراہیمؑ کو اللہ تعالیٰ نے دنیا کی قوموں کی سرداری اور امامت کے لئے منتخب فرمایا۔ احمق ہی ہوگا جو ان کی ملت کی پیروی سے اعراض کرے گا۔

۱۶۰۔ صالحین کا لفظ عام نیکوکاروں کے لئے بھی استعمال ہوا ہے اور اس پورے زمرے کے لئے بھی جو انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین سب پر مشتمل ہے۔ یہاں یہ لفظ اسی دوسرے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

۱۶۱۔ اسلام کے معنی اپنے آپ کو پورے طور پر خدا کی مرضی اور اس کے احکام کے حوالہ کر دینا ہے۔ یہاں اس سے بیٹے کی قربانی کے حکم کی طرف اشارہ ہے۔ یہ کامل سپردگی اور کامل حوالگی کا ایک ایسا معاملہ تھا جس کی تعبیر کے لئے سب سے زیادہ جامع حقیقت افروز لفظ اَسْلَمْتُ ہی کا ہو سکتا ہے۔

۱۶۲۔ یعنی حضرت ابراہیمؑ سے نیچے تین پشتوں تک برابر ملتِ اسلامیہ کی ہی وصیت کی جاتی رہی نہ کہ یہودیت و نصرانیت کی۔ یہ یہودیت و نصرانیت کے فتنے بعد میں اسرائیل نے کھڑے کئے۔

۱۶۳۔ بیٹوں کے جواب سے واضح ہے کہ انہوں نے اللہ کی توحید کا بھی اقرار کیا اور اسی کو سزاوارِ عبادت و اطاعت بھی قرار دیا نیز انہوں نے فخر و اعتقاد کے ساتھ حضرت اسماعیلؑ کا بھی حوالہ دیا جس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت یعقوب کی اولاد کے اندر حضرت اسماعیلؑ اور ان کی ذریت کے خلاف تعصبات پیدا نہیں ہوئے تھے۔

۱۶۴۔ یعنی تمہارا سارا فخر و اعتماد اپنے باپ دادا پر رہ گیا ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ تمہارے حصے کے اعمال بھی وہ انجام دے گئے ہیں اور تمہاری کوئی ذمہ داری نہیں رہ گئی۔ یہ فخر و اعتماد بالکل وہم و خیال پر مبنی ہے۔

اور کہتے ہیں کہ یہودی یا نصرانی بنو تو ہدایت پاؤ گے۔ کہو بلکہ ابراہیم کی ملت کی پیروی کرو جو اللہ کی طرف یکسو تھا اور مشرکین میں سے نہ تھا[165]۔ کہو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس چیز پر ایمان لائے جو ہماری طرف اتاری گئی اور جو ابراہیمؑ، اسمٰعیل، اسحاق، یعقوب اور ان کی اولاد کی طرف اتاری گئی اور اس چیز پر ایمان لائے جو موسیٰ و عیسیٰ اور نبیوں کو ان کے رب کی جانب سے ملی۔ ہم ان میں سے کسی کے درمیان تفریق نہیں کرتے[166]۔ اور ہم صرف اسی کے فرمانبردار ہیں ۞ ۱۳۶۔ اگر وہ اسی طرح ایمان لائے جس طرح تم ایمان لائے تو وہ راہ یاب ہوئے اور اگر وہ اعراض کریں تو پھر درپئے مخالفت ہیں۔ ان کے مقابل میں تمہارے لئے اللہ کافی ہوگا۔ وہ سننے والا اور جاننے والا ہے ۞ ۱۳۷۔

کہہ دو یہ اللہ کا رنگ اختیار کرو اور اللہ کے رنگ سے کس کا رنگ اچھا ہے[167]۔ اور ہم اسی کی بندگی کرتے ہیں ۞

کہہ دو کیا تم ہم سے اللہ کے بارے میں حجت کرتے ہو حالانکہ وہی ہمارا بھی رب ہے۔ وہی تمہارا بھی رب ہے۔ ہمارے لئے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لئے تمہارے۔ اور ہم خالص اسی کے لئے ہیں ۞ ۱۳۹۔

کیا تم دعویٰ کرتے ہو کہ ابراہیم، اسمٰعیل، اسحاق اور یعقوب اور ان کی ذریت کے لوگ یہودی یا نصرانی تھے۔ پوچھو تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ[168]؟ اس سے بڑھ کر ظالم کون ہو سکتا ہے، جو اللہ کی کسی شہادت کو جو ان کے پاس ہے چھپائے۔ اللہ اس چیز سے بے خبر نہیں ہے جو تم کر رہے ہو ۞ ۱۴۰۔

یہ ایک گروہ تھا جو گزر چکا۔ اس کو ملے گا جو اس نے کیا اور تم کو ملے گا جو تم نے کیا اور جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں اس کی بابت تم سے سوال نہ ہوگا ۞ ۱۴۱۔

۱۶۵۔ اسلام کی مخالفت کے جوش میں یہود و نصاریٰ دونوں یہ بات کہتے تھے کہ آدمی ہدایت اور نجات کا طالب ہو تو یہودیت اختیار کرے یا نصرانیت۔ یہ تیسرا دین اسلام بھلا کیا ہے۔ فرمایا کہ ملتِ ابراہیمؑ کی پیروی کرو جو حنیف تھے۔ وہ خدا کی قائم کردہ صراطِ مستقیم، ملتِ اسلام سے سرِ مو اِدھر اُدھر نہیں ہوئے، نہ وہ یہودیت اور نصرانیت کی پگڈنڈیوں کی طرف مڑے، نہ مشرکین کی ضلالتوں میں مبتلا ہوئے۔

۱۶۶۔ خدا کی شریعت اور اس کے نبیوں اور رسولوں کے باب میں یہ امتِ مسلمہ کا موقف بیان ہوا ہے۔ یہ امت خدا کی اتاری ہوئی کسی ہدایت کی نہ تو تردید کرتی ہے اور نہ کسی نبی یا رسول کی تکذیب کرتی ہے بلکہ بغیر کسی تفریق و استثنا کے سب پر ایمان رکھتی ہے۔

۱۶۷۔ یہود و نصاریٰ کو یہ دعوت دی ہے کہ اگر اپنے آپ کو اللہ کے رنگ میں رنگنا چاہو تو یہودیت و نصرانیت کو چھوڑ کر خدا کا رنگ اختیار کرو جو امتِ مسلمہ کے موقف میں مذکور ہوا ہے۔

۱۶۸۔ یعنی ابراہیمؑ اور اولادِ ابراہیمؑ کے زمانوں میں یہودیت و نصرانیت کا کہیں نام و نشان بھی پایا نہیں جاتا تھا۔ یہ نام تو ان کے صدیوں بعد گھڑے ہیں۔ خدا نے ہمیشہ اپنے نبیوں اور رسولوں پر وہی دین اتارا ہے جس کا نام اسلام ہے

۱۴۲ اب جو بے وقوف لوگ ہیں وہ کہیں گے کہ ان لوگوں کو اس قبلہ سے جس پر یہ پہلے تھے کس چیز نے روگردان
کر دیا کہہ دو مشرق اور مغرب اللہ ہی کے ہیں۔ وہ جس کو چاہتا ہے سیدھا رستہ دکھاتا ہے ۞ اور اسی طرح
ہم نے تمہیں ایک بیچ کی امت بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہی دینے والے بنو اور رسول تم پر گواہی دینے
والا بنے۔ اور جس قبلہ پر تم تھے ہم نے اس کو صرف اس لئے ٹھہرایا تھا کہ ہم الگ کر دیں ان لوگوں کو جو
رسول کی پیروی کرنے والے ہیں ان لوگوں سے جو پیٹھ پیچھے پھر جانے والے ہیں۔ بے شک یہ بات بھاری ہے
مگر ان لوگوں پر جن کو اللہ ہدایت نصیب کرے، اور اللہ ایسا نہیں ہے کہ وہ تمہارے ایمان کو ضائع کرنا
چاہے۔ اللہ تو ان لوگوں کے ساتھ بڑا مہربان ہے ۞ ۱۴۳

ان آیات کے زمانۂ نزول تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمان نمازوں میں بیت المقدس کی طرف رُخ کرتے تھے۔ ملت ابراہیمی کے تعلق سے ضروری ہوا کہ اس امت کا قبلہ مسجد حرام ہو۔ اس آیت میں اشارہ ہے اس ردِ عمل کی طرف جو اس تبدیلی سے یہود اور منافقین پر ہونے والا تھا۔

یعنی سمتوں میں سے کسی سمت کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی خصوصیت کی کوئی وجہ نہیں کہ اسے قبلہ قرار دیا جائے البتہ ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ کے تعمیر کردہ گھر بیت اللہ کو یہ خصوصیت حاصل ہے۔

وسط کے معنی ہیں وہ شے جو دو طرفوں کے درمیان میں ہو ایسی شے نقطۂ توسط و اعتدال پر ہوگی، اور یہ اس کے بہتر ہونے کی فطری دلیل ہے۔ امت مسلمہ یہود و نصاریٰ کے پیدا کردہ پیچ و خم سے بچ کر اس صراط مستقیم پر قائم ہے جو دین حق کی اصل خدائی شاہراہ ہے۔

یہ امتِ وسط کے فریضۂ منصبی کا بیان ہے کہ جس طرح پیغمبرؐ نے اس کے سامنے اللہ کے اصلی دین کی گواہی دی ہے اسی طرح یہ خلقِ خدا کے سامنے اللہ کے دین کی شہادت دینے والی ہوگی۔

یہ خانہ کعبہ کو قبلہ قرار دینے کی حکمت بیان ہوئی ہے کہ اس طرح اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو امتحان میں ڈال کر ان کے کھرے کھوٹے میں امتیاز کیا ہے۔ امتحان نہ ہو تو اچھے اور بُرے، خام اور پختہ میں کوئی فرق ہی نہ رہ جائے۔

بقیہ فہم قرآن کے اصول

جو چل پڑھ رہا ہے اس سے دوسرے فوائد جو بھی حاصل ہوں وہ حاصل ہو سکتے ہیں لیکن قرآن و حدیث کے علم کے لئے یہ چیز بالکل بے سود ہے۔

(ترتیب: عبداللہ غلام احمد)

امین احسن اصلاحی

فہم قرآن کے چند بنیادی اصول (۴)

۴۔ قرآنِ مجید قریش کی ٹکسالی زبان میں نازل ہوا ہے

اگرچہ یہ ایک معمولی بات ہے اور بظاہر اس کو اس اہمیت کے ساتھ بیان کرنے کی ضرورت نہیں تھی مگر ایک خاص طرح کی صورت حال کی وجہ سے اس پر بحث کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ امام شافعیؒ نے اپنی اصولِ فقہ کی کتاب میں قرآنِ مجید کی زبان پر بڑی تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے۔ انہوں نے عربی زبان پر کامل عبور اور دسترس رکھنے کی ضرورت پر جس زور سے لکھا ہے اس پر مجھے بڑی حیرت ہوئی لیکن غور کرنے پر معلوم ہوا کہ امام شافعیؒ کے اس چیز پر اس قدر زور دینے کا سبب یہ ہے کہ دین اور شریعت کا ماخذ اور حق و باطل کے لئے کسوٹی قرآن مجید ہی ہے۔ اسی سے عقائد، فقہ اور حکمت کے اصول معین ہوتے ہیں۔ قرآنِ مجید کو سمجھنے میں اگر غلطی ہو جائے تو ہر چیز کی بنیاد ہی غلط ہو جائے گی۔

علاوہ ازیں یہ بات بھی ہے کہ قرآن کی عربی فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے معجزے کی حد کو پہنچی ہوئی ہے۔ قرآنِ مجید نے خود کفار قریش کو چیلنج کیا ہے کہ تم اگر زیادہ نہ کر سکو تو ایک ہی سورہ قرآن کی مانند پیش کر کے دکھا دو اور اگر تمہارے لئے تنہا اپنے بل بوتے پر یہ کام مشکل ہو تو تمہارے پاس ادیب و خطیب بھی ہیں، شاعر اور کاہن بھی ہیں، جنات بھی ہیں اور شیاطین بھی ہیں اور تمہارے بہت سے دیوی دیوتا بھی ہیں، قرآنِ پاک کا مقابلہ کرنے کے لئے تم ان سب کی مدد حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ فرمایا!

وَاِنْ كُنْتُمْ فِىْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۠ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ (البقرہ۔۲۳)	اگر تم اس چیز کی جانب سے شک میں ہو جو ہم نے اپنے بندے پر اتاری ہے تو لاؤ اس کے مانند کوئی سورہ، اور بلا لو اپنے حمایتیوں کو اللہ کے سوا، اگر تم سچے ہو۔
قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ	کہہ دو اگر تمام جن و انس متفق ہو کر بھی

عَلٰٓی اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِیْرًا ۝ (بنی اسرائیل - ۸۸)

زور لگائیں کہ اس قرآن کی مثال پیش کریں تو اس کی مثال پیش نہ کر سکیں گے اگرچہ وہ ایک دوسرے کے مددگار بھی بن جائیں۔

قرآنِ مجید کے اس چیلنج کے اصل مخاطب اگرچہ اہلِ عرب تھے، غیر اہلِ عرب کے لئے اس قسم کے چیلنج کا سوال پیدا نہیں ہوتا لیکن قرآن کے ہر مخالف اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے ہر منکر کے لئے خواہ وہ عرب سے تعلق رکھتا ہو یا عجم سے قرآن کے زمانۂ نزول سے لے کر آج تک یہ چیلنج موجود ہے۔ یہ حقیقت اپنی جگہ پر مسلّم ہے کہ چودہ سو سال گزرنے پر بھی کوئی شخص قرآنِ مجید کی چھوٹی سے چھوٹی سورت کے مانند بھی کوئی کلام پیش نہیں کر سکا۔

عرب جاہلیت میں شاعروں اور خطیبوں، خاص طور پر شعرائے سبعہ معلقہ کی بڑی عظمت وعزت تھی۔ لبید شعرائے سبعہ معلقہ میں سے آخری شاعر ہیں۔ ان کا کلام اس قدر بلند پایہ تھا کہ ان کے ایک شعر پر سوقِ عکاظ میں تمام شعرائے عرب نے سجدہ کیا اور عرب کی روایت کے مطابق ان کا قصیدہ خانہ کعبہ میں آویزاں کیا گیا۔ کسی کے کلام کا خانہ کعبہ میں آویزاں کیا جانا اس وقت سب سے بڑا اعزاز تھا۔ یہی لبید بعد میں مسلمان ہو گئے تو انہوں نے شعر کہنا ترک کر دیا۔ جو شاعر تمام عرب شعراء کا مسجود وقت کا ملک الشعراء اور عرب کی فصاحت وبلاغت کا مظہر کامل ہو، اس کا یوں ترکِ شعر لوگوں کے لئے تعجب کا باعث ہوا۔ کسی نے ان سے استفسار کیا کہ اب آپ شعر نہیں کہتے؟ تو انہوں نے جواب دیا "أبعد القرآن" (کیا قرآن کے بعد بھی اس کی گنجائش رہ گئی ہے)۔ قرآن کے اعجازِ بلاغت کے آگے سرافگندگی اور سپراندازی کا یہ اظہار واعتراف اس عظیم شاعر کی طرف سے ہے جو اپنے زمانے میں فصاحت وبلاغت کا نشان وعلم تھا جب وہ اس طرح قرآنِ مجید کے آگے سربسجود ہو گیا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ عرب کی تمام فصاحت وبلاغت نے قرآنِ مجید کی فصاحت وبلاغت کے آگے گھٹنے ٹیک دیئے۔ اس کے بعد کسی اور کے لئے قرآن کے آگے نگاہیں اونچی کرنے کا کیا امکان باقی رہا!

عربی زبان سے ہمارا تعلق قرآن وحدیث کی بدولت ہے۔ اگر قرآن وحدیث سے اس کا تعلق نہ ہوتا تو یہ بھی زبانوں میں سے ایک زبان تھی۔ اس کے لئے ترجیح کا کوئی پہلو نہ تھا لیکن قرآن وحدیث عربی زبان میں ہیں جن پر ہمارے دین کا انحصار ہے اس لئے امت کے ایک گروہ پر فرض ہے کہ وہ اس عربی کو لازماً سیکھے اور اس میں پوری مہارت حاصل کرے جس میں

قرآن نازل ہوا ہے۔ اس گروہ کو زبان میں وہ مرتبہ اور مقام حاصل ہو کہ وہ پورے اطمینان سے فیصلہ کر سکے کہ فلاں آیت یا فلاں لفظ کا مفہوم کیا ہے یہاں تک کہ اس کو بڑے سے بڑے ماہرِ زبان پر بھی تنقید کرنی پڑے تو وہ اس پر بھی تنقید کر کے اس کے حق اور باطل کو ممیّز کر سکے۔ جن لوگوں کو یہ مقام حاصل ہو جاتے وہ بیشک قرآن اور حدیث پر غور کر سکتے ہیں، اس سے استنباط کر سکتے ہیں اور یہ بتا سکتے ہیں کہ یہاں امر کس مقصد کے لئے ہے اور نہی سے کیا مراد ہے؟ نیز ہر خطاب کن لوگوں سے ہے اور کلام کا اصل رُخ کن کی طرف ہے؟

اس وقت ایک بڑی مشکل یہ بھی ہے کہ وہ زبان جس میں قرآنِ مجید نازل ہوا کہیں بھی رائج نہیں ہے۔ عرب اور عجم دونوں ہی میں جو عربی پڑھی، پڑھائی اور لکھی بولی جاتی ہے وہ اپنے اسلوب وانداز، اپنے لب ولہجہ اور الفاظ ومحاورات میں اس زبان سے بہت مختلف ہے جس میں قرآن نازل ہوا ہے۔ ہمارے عربی مدارس میں جو عربی پڑھی پڑھائی جاتی ہے وہ قلیوبی نفحۃ الیمن یا زیادہ سے زیادہ حریری ومتنبی کے انداز کی عربی ہے۔ عرب، شام اور مصر میں جو عربی رائج اور مقبول ہے اس کا اندازہ ان ممالک کے رسائل واخبارات سے کیا جا سکتا ہے۔ یہ زبان عربی ضرور ہے لیکن امتدادِ زمانہ کے ساتھ اس کے اسلوب (STYLE) میں بہت تبدیلی آچکی ہے۔ ہر دور میں عجمی زبانیں اس پر اثر انداز ہوتی رہی ہیں اور موجودہ دور میں تو اس کے اسالیب پر مغربی زبانیں مثلاً انگریزی اور فرانسیسی زیادہ غالب ہیں۔ آپ کو عربی اخبار پڑھتے ہوئے محسوس ہوگا کہ یہ انگریزی زبان کا بالکل لفظی ترجمہ ہے۔ یہ زبان قرآن کی زبان سے اس قدر مختلف ہے کہ اس کا ذوق نہ صرف یہ کہ قرآن کی زبان کا کوئی ذوق پیدا نہیں کرتا بلکہ قرآن سے بیگانہ کرتا ہے۔

قرآن کی زبان سیکھنے کے وسائل

قرآن وحدیث کی معاصر زبان چونکہ نہ عربی مدارس میں ملتی ہے اور نہ اخبارات ورسائل میں، اس لئے اس کو سیکھنے کے لئے نہایت کاوش، جاں فشانی اور مستعدی کی ضرورت ہے۔ اگرچہ یہ ایک کٹھن کام ہے لیکن یہ ناممکن نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن وحدیث کی بدولت اس زبان کو زندہ رکھنے کے لئے خود سامان مہیا کر دیا ہے۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم افصح العرب والعجم ہیں۔ آپ کا کلام فصیح ترین کلام ہے جس کا بہت بڑا ذخیرہ حدیث کی صورت میں محفوظ ہو گیا ہے۔ حدیث کی زبان فصاحت وبلاغت کے اعتبار

سے نہایت بلند ہے۔ اس میں اور قرآن کی زبان میں بس وہی فرق ہے جو اللہ تعالیٰ کے کلام اور اس کے پیغمبر کے کلام میں ہو سکتا ہے۔ آپ کے صحابہؓ خصوصاً خلفائے راشدینؓ کے کلام کی شان بھی بہت بلند ہے۔ قرآن کے طالب علم کو ان تمام چیزوں کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ ان کے مطالعہ سے اس کو قرآن کی لفظی اور معنوی ہر قسم کی مشکلات حل کرنے میں مدد ملے گی۔

جو شخص قرآن مجید کی زبان کے ایجاز و اعجاز کا اندازہ کرنا چاہے اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ امرء القیس، عمرو بن کلثوم، زہیر اور لبید جیسے شعراء اور قس بن ساعدہ جیسے بلند پایہ خطیبوں کے کلام کے محاسن و معایب کے سمجھنے کا ذوق بھی پیدا کرے۔ اس کے بغیر نہ تو کوئی شخص یہ اندازہ کر سکتا ہے کہ قرآن عربی زبان کے محاسن کا کیسا کامل نمونہ ہے اور نہ یہ سمجھ سکتا ہے کہ اس کے اندر وہ کیا جادو ہے جس نے تمام فصیحوں اور بلیغوں کو ہمیشہ کے لئے عاجز و درماندہ کر دیا۔ اگرچہ زمانۂ جاہلیت کے شاعروں اور خطیبوں کے کلام کا بڑا حصہ دست بُردِ زمانہ کی نذر ہو گیا تاہم اتنا ذخیرہ اب بھی موجود ہے کہ اصل مقصد کے لئے کفایت کرتا ہے۔ ادھر شعرائے جاہلیت کے ایسے دواوین شائع ہوتے ہیں جو پہلے ناپید تھے۔ شعراء اور خطباء کے کلام کے مجموعے پہلے سے بھی موجود ہیں۔ اگرچہ ان کے اندر منحول کلام بھی شامل ہے لیکن عربیت کا ذوق رکھنے والے آسانی سے ان کے خالص اور منحول کلام میں امتیاز کر سکتے ہیں۔

کلامِ جاہلیت اور خطباتِ جاہلیت کا اگر غور سے مطالعہ کیا جائے تو اس سے نہ صرف زبان کا ذوق پیدا ہوتا ہے بلکہ اہلِ عرب کے معروف و منکر، انکی معاشرتی زندگی کی خصوصیات، ان کے معاشرے میں خیر و شر کے معیارات، ان کے سماجی، تمدنی اور سیاسی نظریات، روزمرہ کی زندگی میں ان کی دلچسپیاں اور مشاغل، ان کے مذہبی رسوم و اعتقادات غرض اس طرح کی ساری چیزوں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ان چیزوں سے صحیح واقفیت اس شخص کے لئے نہایت ضروری ہے جو قرآن کے اشارات و تلمیحات اور اس کی تعریضات و کنایات کو اچھی طرح سمجھنا اور دوسروں کو سمجھانا چاہتا ہو۔

غرض کلامی مسائل ہوں یا فقہی اور اخلاقی ہر ایک کے غث و سمین میں امتیاز کیلئے کسوٹی قرآن ہے اور قرآن کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کی زبان کا نہایت اعلیٰ ذوق ہو۔ اگرچہ اس نیشِ عشق کے گوارا ہونے کے لئے ایک عمر چاہیئے لیکن یہ ایک ناگزیر امر ہے اس کو گوارا کئے بغیر قرآن کے علم کی راہ نہیں کھل سکتی۔ یہاں یہ تنبیہہ بھی ضروری ہے کہ اس زمانہ میں تجارتی اور سیاسی مقاصد سے عربی سیکھنے اور سکھانے کا

باقی صفحہ ۲۱ پر ملاحظہ کیجئے

اصول تدبر حدیث
امین احسن اصلاحی

صحابہؓ اور صحابیت

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے علم و عمل کے منتقل ہونے کا اولین ذریعہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں۔ اس وجہ سے امت میں ان کو اوّلیت و عظمت کا جو مقام حاصل ہے وہ کسی اور کو حاصل نہیں ہے۔ امت کے گل سرسبد وہی ہیں۔ یہ مقام وہ مقام ہے کہ جس کے بعد امت میں کسی اور کو وہ درجہ حاصل نہیں ہوگا اس لئے کہ ساری دنیا کو دین انہیں صحابہؓ کے ذریعہ سے ملا ہے۔ اسی لئے قرآن مجید نے ان کو بڑا درجہ دیا، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان کو بڑا درجہ دیا ہے اور ہمارے محدثین نے بھی ان کو جو درجہ دیا ہے، وہ خواہ ماثور اور منقول نہ ہو، لیکن کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس سے اختلاف کیا جائے۔

اب ہم اس حقیقت کا جائزہ ذرا تفصیل سے لیتے ہیں۔

صحابہؓ کی تعدیل قرآن میں

اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرامؓ کو امت کے ہراول دستہ اور "شہداء اللہ فی الارض" کا درجہ دیا ہے۔

فرمایا:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (البقرة-۲:۱۴۳)

اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک بیچ کی امت بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہی دینے والے بنو اور رسول تم پر گواہی دینے والا بنے۔

اس آیت سے ایک تو یہ حقیقت ظاہر ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دینِ حق کی تبلیغ و دعوت اور اقامت کی ذمہ داری جس طرح اپنے رسولؐ پر ڈالی اسی طرح سے یہ ذمہ داری رسولؐ کے بعد صحابہؓ پر عائد ہوئی۔ اور یہ ذمہ داری ان کے اوپر مجرد ایک نفلی نیکی کی حیثیت سے نہیں، بلکہ بحیثیت ایک فریضۂ منصبی کے ڈالی گئی۔

دوسری یہ حقیقت ظاہر ہوئی کہ صحابہؓ کو امت میں جو شرف حاصل ہے وہ "شہداء اللہ علی الناس"

یعنی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے علم وعمل کے وارث اور گواہ ہونے کی بنا پر ہے۔

صحابہؓ کی تعدیل حدیث میں

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کو جو درجہ دیا ہے وہ متعدد حدیثوں سے واضح ہے۔ ہم الکفایۃ فی علم الروایۃ سے لطور مثال ایک حدیث نقل کرتے ہیں۔

عن ابن عباس، قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: "مهما اوتيتم من كتاب الله فالعمل به لا عذر لاحدكم فی تركه، فان لم يكن فی كتاب الله فسنة منی ماضية، فان لم تكن سنة منی ماضية فما قال اصحابی، ان اصحابی بمنزلة النجوم فی السماء فايها اخذتم به اهتديتم۔ [1]

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو کچھ تمہیں کتاب اللہ میں سے ملا ہے اس پر عمل واجب ہے۔ اس کے ترک کے لئے تمہارا کوئی عذر مسموع نہیں ہے پس اگر کتاب اللہ میں کوئی بات نہ ملے تو جو میری سنت چلی آرہی ہو اس پر عمل کرو۔ اگر میری کوئی ماثور سنت نہ ہو تو جو میرے اصحاب نے کہا اس پر چلو۔ بیشک میرے اصحاب آسمان کے ستاروں کی منزلت میں ہیں۔ ان میں سے جس کو بھی اختیار کروگے رہنمائی پاؤگے۔

اس سے معلوم ہوا کہ حضرات صحابہؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت بتانے والے بھی ہیں اور خود بھی رہنمائی کے مینار ہیں۔ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے علم وعمل کے منتقل ہونے کا ذریعہ ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے شرف کی جو بنیاد خود بتائی وہ ان کا ذریعہ ہدایت ہونا ہے۔

صحابہؓ کی عدالت کے بارے میں محدثین کی رائے

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اس عظمت واہمیت کے سبب سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے علم وعمل کی روایت کے باب میں محدثین نے ان کو یہ درجہ دیا کہ ان کو جرح سے بالاتر قرار دیا۔ ان کے باب میں محدثین کا اصول یہ ہے کہ "الصحابۃ کلھم عدول" صحابہؓ بلا استثناء سب جرح سے بالاتر ہیں۔ ایک راویت

[1] الکفایۃ فی علم الروایۃ، باب ماجاء فی تعدیل اللہ ورسولہ للصحابہ

کے رد و قبول کے لئے دوسرے تمام راویوں کے خیر و شر کی تحقیق کی جائے گی اور صرف تحقیق کے بعد ہی ان کی روایت قبول ہوگی، لیکن صحابیؓ اس طرح کی تحقیق سے بالاتر ہوں گے۔

روایت حدیث کے ضمن میں صحابہ کرامؓ کی عدالت کے اس اصول سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ 'صحابی' کی تعریف کیا ہے؟ کیا وہ شخص جس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو محض ایک دو بار دیکھا تو ہو لیکن نہ کوئی خاص صحبت اٹھائی ہو اور نہ آپ سے تربیت پائی ہو، وہ بھی جرح وتعدیل سے بالاتر اور روشنی اور ہدایت کا مینار سمجھا جائے گا؟

محدثین میں اس سوال کے جواب میں اختلاف ہوا ہے اور یہ اختلاف قدرتی ہے۔ ان کو رائے کے اعتبار سے، ہم تین نمایاں گروہوں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔

پہلے گروہ کی رائے

اس ضمن میں پہلے گروہ، جس کے نمایاں آدمی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ہیں، کی رائے ان کے اپنے الفاظ میں یہ ہے:

قال ابن عمر: ورایت اهل العلم يقولون كل من رای رسول الله صلی الله عليه وسلم وقد ادرك الحلم واسلم وعقل امر الدين ورضيه فهو عندنا ممن صحب النبی صلی الله عليه وسلم ولو ساعة من نهار، ولكن اصحابه علی طبقاتهم وتقدمهم فی الاسلام [1]

حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ صحابہ کے طبقات اگرچہ ان کے علم اور تقدم فی الاسلام کی بنیاد پر قائم ہیں، لیکن میں نے اہل علم کو دیکھا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ جس نے بلوغ اور اسلام اور دین کے کچھ شعور کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے، اگرچہ ایک گھڑی ہی کے لئے اس نے ہمارے نزدیک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اٹھائی۔

'تقدم فی الاسلام' سے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی مراد یہ ہے کہ سب صحابہؓ ایک درجے کے نہیں ہیں۔ بہرحال ان میں مختلف طبقات ہیں۔ بعض بہت اونچے درجے کے ہیں، بعض متوسط درجے کے ہیں اور بعض نیچے درجے کے ہیں۔

[1] الکفایۃ فی علم الروایۃ، باب القول فی معنی وصف الصحابی ا صحابی

دوسرے گروہ کی رائے

اس کے مقابل میں دوسرے گروہ کی رائے سعید بن مسیبؒ کے الفاظ میں یہ ہے:

كان سعيد بن المسيب يقول الصحابة لا نعدهم الا من اقام مع رسول الله صلى الله عليه وسلم سنة او سنتين وغزا معه غزوة او غزوتين[1]

سعید بن مسیب فرماتے ہیں کہ ہم صحابی صرف انہی کو شمار کرتے ہیں جنہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سال دو سال قیام کیا ہو اور آپ کی معیت میں ایک دو غزوات میں شریک ہوئے ہوں۔

تیسرے گروہ کی رائے

اسی سلسلہ میں صاحب الکفایۃ فی علم الروایۃ نے ایک اور محقق کا قول بھی نقل کیا ہے، جس کی حیثیت ایک محاکمہ کی ہے، جس سے مسئلہ کی صحیح نوعیت بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ وہ یہ ہے۔

لا خلاف بين اهل اللغة في ان القول 'صحابي' مشتق من الصحبة، وانه ليس بمشتق من قدر منها مخصوص، بل هو جار على كل من صحب غيره قليلا كان او كثيرا... ومع ذلك فقد تقرر للامة عرف في انهم لا يستعملون هذه التسمية الا فيمن كثرت صحبته واتصل لقاؤه، ولا يجرون ذلك على من لقي المرء ساعة ومشى معه خطى، وسمع منه حديثا، فوجب لذلك ان لا يجري هذا الاسم في عرف الاستعمال الا على من هذه حاله، ومع هذا فان خبر الثقة الامين عنه مقبول ومعمول به، وان لم تطل صحبته، ولا سمع منه الا حديثا واحدا۔

اہل لغت میں اس باب میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ صحابی 'صحبۃ' کے مادہ سے مشتق ہے اور اس میں صحبت کی کسی خاص مقدار کا اعتبار نہیں ہے بلکہ قلیل یا کثیر، دونوں قسم کی صحبت مراد ہو سکتی ہے اس وجہ سے باعتبار لغت ہر وہ شخص صحابی سمجھا جا سکتا ہے جس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت حاصل ہوئی ہو، خواہ قلیل یا کثیر لیکن اس کے باوجود یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس امت میں یہ بات معروف کی حیثیت حاصل کر چکی ہے کہ لفظ 'صحابی' اسی شخص کے لئے بولا جاتا ہے جس نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زیادہ صحبت اٹھائی ہو، جن کی ملاقات مسلسل رہی ہو۔ اس شخص کے لئے یہ لفظ استعمال نہیں ہوتا جو کبھی کچھ دیر کے لئے مل لیا ہو یا چند قدم ساتھ چل لیا ہو یا آپ سے کوئی بات سن لی ہو۔ اس وجہ سے یہ ضروری ہے کہ اس لفظ کا استعمال اسی کے لئے ہو جس کے لئے فی الواقع موزوں ہے، اگرچہ ایک ثقہ اور امین کی روایت اس سے مقبول ہوگی اور اس پر عمل بھی ہوگا ہر چند اس کو طویل صحبت حاصل نہ ہوئی ہو، اور اس نے ایک ہی حدیث سنی ہو۔

[1] الکفایۃ فی علم الروایۃ، باب القول فی معنی وصف الصحابی انہ صحابی

اس اقتباس میں ان محقق کی بات کا پہلا حصہ کمزور ہے کہ 'صحبۃ' کے لفظ میں قلیل اور کثیر کا اعتبار نہیں ہے، 'صحبۃ' کے لفظ ہی میں طول صحبت کا مفہوم شامل ہے۔ 'صحبۃ' اس کو نہیں کہتے کہ اچانک آپ کی نظر کسی پر پڑ گئی یا چند قدم اس کے ساتھ ہو لیے۔ یہ لفظ خود کثرت ملاقات کے اوپر دلیل ہے۔ البتہ تحقیق کا دوسرا حصہ مضبوط ہے۔ اس سے ہم نتیجہ تک پہنچتے ہیں کہ امت کے اکابر اہل الرائے نے صحابیؓ ہونے میں بطور شرط اس بات کو ملحوظ رکھا ہے کہ وہ خاصی مدت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہے ہوں اور اسلام کے لئے ان کی خدمات ہوں۔ اس تعریف کے مطابق صحابہؓ کے وہ تمغوں منصب جو قرآن مجید اور حدیث میں بیان ہوئے ہیں وہ ثابت ہوتے ہیں اور محدثین کے اس اصول کا صحیح محل بھی سمجھ میں آتا ہے کہ وہ جرح سے ماوراء ہیں۔

صحابیت از روئے قرآن

قرآن مجید میں صحابہؓ کی تعریف میں جو آیتیں وارد ہیں اور جن کا محدثین صحابہؓ کی تعدیل کے سلسلہ میں حوالہ دیتے ہیں ان سے بھی یہی حقیقت واضح ہوتی ہے کہ قرآن کے پیش نظر وہی لوگ ہیں جنہوں نے دین کے اختیار کرنے میں پیش قدمی کی ہے، عسر اور یسر میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے ہیں، اللہ کی راہ میں اپنا مال خرچ کیا ہے، غزوات میں سرفروشیاں کی ہیں۔ وہ لوگ پیش نظر نہیں ہیں جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی کبھار دیکھ لیا ہے۔ اعراب کے منافقین کی تو قرآن نے اصل خرابی یہی بتائی ہے کہ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت نہیں اٹھائی، اگرچہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا بھی اور اسلام کے بھی بڑی بلند آہنگی سے مدعی تھے۔

اس باب میں قرآن مجید کی آیات کا استقصاء کیجئے اور ان پر ایک نظر اس پہلو سے ڈالیے کہ ان میں صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے شرف کے پہلو کو کوئی اہمیت دی گئی ہے یا آپؐ کی معیت ورفاقت، نصرت وحمایت اور آپؐ سے اخذ وتلقی کو اصل اہمیت حاصل ہے۔

اس سلسلے کی سب سے اہم آیت سورۃ بقرہ کی وہ آیت ہے جو اوپر گزر چکی ہے۔ اس میں صحابہؓ کا اصلی وصف نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے علم وعمل کا حامل اور اس کا داعی ومبلغ ہونا بیان ہوا جو طول صحبتؐ رفاقت اور کمال اخلاص وفدویت کو مستلزم ہے۔

اس سلسلے کی دوسری آیت وہ ہے جس کا تعلق ان سرفروشوں سے ہے جنہوں نے گھر سے سینکڑوں میل دور عین دشمن کے شہر کی دیواروں کے نیچے نہتے ہونے کے باوجود، رسول اللہؐ کی دعوت جہاد پر سرکٹانے کے لئے بیعت کی۔

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ۝

(الفتح - ۴۸ : ۱۸)

اللہ راضی ہوا ایمان والوں سے جب کہ وہ تم سے بیعت کر رہے تھے درخت کے نیچے تو اللہ نے ان کے دلوں کا حال جان لیا تو ان پر طمانیت اتاری اور ان کو ایک عنقریب ظاہر ہونے والی فتح سے نوازا۔

یہ مضمون سورۃ توبہ میں بھی بیان ہوا ہے۔

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ

(التوبہ - ۹ : ۱۰۰)

اور مہاجرین وانصار میں سے جو سب سے پہلے سبقت کرنے والے ہیں اور پھر جن لوگوں نے خوبی کے ساتھ ان کی پیروی کی ہے اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اس سے راضی ہوئے۔

صحابہ کرامؓ کے یہ اوصاف زیادہ تفصیل کے ساتھ سورۃ حشر میں یوں بیان ہوتے ہیں۔

لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ

یہ خاص طور پر ان محتاج مہاجرین کے لئے ہے جو اپنے گھروں اور اپنی املاک سے نکالے گئے ہیں اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی کی طلب

وَرَسُوْلَهٗ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۝

(الحشر - ۵۹ : ۸-۹)

اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی مدد کرتے ہوئے۔ یہی لوگ اصل راست باز ہیں۔ اور جو لوگ پہلے سے ٹھکانے بنائے ہوئے اور ایمان استوار کیے ہوئے ہیں وہ دوست رکھتے ہیں ان لوگوں کو جو ہجرت کر کے ان کی طرف آرہے ہیں اور جو کچھ ان کو دیا جا رہا ہے اس سے وہ اپنے دلوں میں کوئی خلش نہیں محسوس کر رہے ہیں اور وہ ان کو اپنے اوپر ترجیح دے رہے ہیں، اگرچہ انہیں خود احتیاج ہو۔

ان آیات پر تدبر کیجئے تو معلوم ہوگا کہ ان میں صحابہؓ کی صرف تعدیل ہی نہیں، بلکہ دنیا اور آخرت دونوں میں ان کی جو تعظیم وتشریف بیان ہوئی ہے اس میں کوئی دوسرا گروہ ان کا شریک وسہیم نہیں۔ لیکن قرآن نے اس کا سبب یہ نہیں بتایا کہ انہوں نے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زیارت کی ہے، بلکہ یہ بتایا ہے کہ انہوں نے اسلام کی راہ میں سبقت کی ہے۔ اس کی خاطر ہجرت اور جہاد کی بازیاں کھیلی ہیں، اللہ کے دین اور اس کے رسولؐ کی نصرت کے لئے اپنا سب کچھ قربان کیا ہے اور انصار نے اپنے مہاجر بھائیوں کو اپنے گھروں اور اپنی جائیدادوں میں حصہ دار بنا لیا ہے۔

اس وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک آدھ بار دیکھنے والوں کے متعلق حقیقت پسندانہ بیان ہمارے نزدیک وہ ہے جو عاصم احولؒ سے منقول ہے:

انه قال قد رای عبد الله بن سرجس رسول الله صلی الله علیه وسلم غیر انه لم یکن له صحبة [1]

انہوں نے کہا، عبداللہ بن سرجس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا، لیکن ان کو صحبت نہیں حاصل ہوئی۔

ان کے نزدیک، گویا مجرد دیکھنے کو صحبت میں کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں ہے۔ حضورؐ کو دیکھنے کے بارے میں ہم محتاط رہتے ہوئے زیادہ سے زیادہ وہ مسلک اختیار کر سکتے ہیں جو شعبہؒ سے منقول ہے۔

---

[1] الکفایة فی علم الروایة، باب القول فی معنی وصف الصحابی انه صحابی

قال كان جندب بن سفيان اتى النبي صلى الله عليه وسلم وان شئت قلت له صحبة [1]

حضرت جندب بن سفیان رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتے تھے اور کوئی چاہے تو کہہ سکتا ہے کہ ان کو کچھ صحبت بھی حاصل ہوئی۔

اس بات کو بعض لوگوں نے یوں بھی کہا ہے کہ "کان له رؤیة" ان کو ایک بار زیارت کا شرف حاصل ہوا۔

خلاصۂ بحث

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کا شرف اپنی جگہ بہت بڑا شرف اور ایک مسلمان کی سب سے بڑی سعادت ہے۔ لیکن قرآن مجید نے محض اس زیارت کو اہمیت نہیں دی۔ قرآن مجید کی رو سے حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کو جو عظمت و مرتبہ حاصل ہے اس کا تعلق تمام تر ان خدمات، سرفروشیوں اور جاں نثاریوں سے ہے جو انہوں نے اللہ کے رسول کی نصرت اور اس کے دین کی ترویج کے لئے دکھائیں۔ انہی خدمات کی کمی بیشی کے اعتبار سے ان کے طبقات و مدارج معین ہوئے۔ اگر مجرد رسول اللہ کو دیکھنا کوئی شرف ہوتا تو اس اعتبار سے مخلفین احزاب و تبوک، منافقین مدینہ و اہل بدو اور بانیان مسجد ضرار کچھ کم اس شرف کے حق دار نہ تھے۔ ان لوگوں نے رسول اللہ کو دیکھا ہی نہیں بلکہ آپ کے ہمراہ بعض غزوات میں بھی شریک رہے، الٹے سیدھے انفاق بھی کرتے رہے۔ لیکن قرآن نے جس طریقہ سے ان کو لتاڑا ہے اسے سورۂ منافقون، سورۂ توبہ اور سورۂ انفال میں پڑھ لیجئے۔ لہٰذا جہاں تک روایت حدیث کا تعلق ہے اس میں تو صحابہ کا ہر طبقہ اور گروہ یکساں طور پر شامل سمجھا جائے گا، البتہ فہم حدیث میں انہی صحابہ کا علم انہی کی روایات کے الفاظ اور انہی کی تنقیدات قابل ترجیح ہوں گی جو تدبر حدیث کے نقطۂ نظر سے سب سے ممتاز ہیں، جیسے خلفائے راشدین، حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت ابو الدرداء، حضرت معاذ بن جبل، حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت عبداللہ بن عباس وغیرہ رضی اللہ عنہم۔ جو لوگ حدیث پہ تدبر کریں گے ان کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ حدیث کے معاملے میں اہل تدبر کون لوگ ہیں۔

(ترتیب: ماجد خاور)

---

[1] الکفایة فی علم الروایة، باب القول فی معنی وصف الصحابی انه صحابی

خالد مسعود

ارادہ اور عمل کا صلہ

عن ابن عباس عن رسول الله صلى الله عليه وسلم فيما يروى عن ربه تبارك وتعالى قال ان الله كتب الحسنات والسيئات ثم بين ذلك فمن هم بحسنة فلم يعملها كتبها الله عنده حسنة كاملة وان هم بها فعملها كتبها الله عز وجل عنده عشر حسنات الى سبعمائة الى اضعاف كثيرة وان هم بسيئة فلم يعملها كتبها الله عنده حسنة كاملة وان هم بها فعملها كتبها الله سيئة واحدة (صحیح مسلم، کتاب الایمان باب تجاوز اللہ عن حدیث النفس)

ترجمہ:

"ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو حدیثیں اللہ تبارک و تعالیٰ سے روایت کی ہیں ان میں سے ایک میں آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے نیک کام اور برے کام معین کر دیئے اور پھر ان کو اچھی طرح واضح کر دیا۔ پس جس شخص نے ایک نیکی کا ارادہ کیا لیکن اس پر عمل نہ کر سکا تو اللہ تعالیٰ اس کی ایک کامل نیکی لکھ لیتا ہے۔ اگر وہ ارادہ کرے اور اس پر عمل بھی کرے تو اللہ تعالیٰ اس کی دس سے لے کر سات سو گنا بلکہ اس سے بھی زیادہ نیکیاں لکھتا ہے۔ اگر وہ شخص برے کام کا ارادہ کرے لیکن اس پر عمل نہ کرے تو اللہ تعالیٰ اپنے ہاں اسے ایک نیکی لکھ لیتا ہے اور اگر وہ اس پر عمل بھی کرے تو وہ اسے ایک برائی لکھتا ہے۔"

نظائر حدیث

یہ روایت تھوڑے سے تغیر الفاظ کے ساتھ صحیح بخاری میں یوں بیان ہوئی ہے:

عن ابی ھریرہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال یقول اللہ اذا اراد عبدی ان یعمل سیئۃ فلا تکتبوھا علیہ حتی یعملھا فان عملھا فاکتبوھا بمثلھا وان ترکھا من اجلی فاکتبوھا لہ حسنۃ واذا اراد ان یعمل حسنۃ فلم یعملھا فاکتبوھا لہ حسنۃ فان عملھا فاکتبوھا لہ بعشر امثالھا الی سبعمائۃ۔

(صحیح بخاری، کتاب التوحید، باب قول اللہ یریدون ان یبدلوا کلام اللہ)

"ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا اللہ تعالیٰ یوں فرماتا ہے کہ جب میرا کوئی بندہ کسی برے کام کا ارادہ کرے تو جب تک وہ اس پر عمل نہ کرے اس کی برائی نہ لکھو اگر وہ اس پر عمل کرے تو اس برائی کے مثل اس کا گناہ لکھو اور اگر میری وجہ سے برائی کا ارادہ ترک کردے تو اس کی ایک نیکی لکھو۔ اگر بندہ نیکی کرنا چاہے لیکن عملاً ایسا نہ کرسکے تو اس کی ایک نیکی لکھ لو۔ اگر وہ اس کو عملی جامہ پہنا لے تو اس کی دس سے لے کر سات سو گنا تک نیکیاں لکھو"

بخاری کی اس روایت میں مسلم کی روایت پر دو اضافے ہیں۔ ایک یہ کہ برے کام کے محض ارادے کو بندے کی بدی شمار نہ کیا جائے اور اس ارادے کو ترک کرنا اس کے لئے اس وقت نیکی قرار پائے جب وہ خداوندی کی خاطر اس ارادے سے باز آئے۔ ان دونوں اضافوں کی تائید مسلم کی ایک حدیث سے ہوتی ہے جس کے راوی ابوہریرہؓ ہی ہیں:

..... اذا تحدث بان یعمل سیئۃ فانا اغفرھا لہ مالم یعملھا فاذا عملھا فانا اکتبھا لہ بمثلھا وقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قالت الملائکۃ رب ذاک عبدک یرید ان یعمل سیئۃ وھو ابصر بہ فقال ارقبوہ فان عملھا فاکتبوھا لہ بمثلھا وان ترکھا فاکتبوھا لہ حسنۃ انما ترکھا من جرای

(کتاب الایمان باب تجاوز اللہ عن حدیث النفس)

"اللہ تعالیٰ فرماتا ہے) جب میرا بندہ برائی کرنے کا خیال کرتا ہے تو میں اسے اس وقت تک معاف کرتا ہوں جب تک وہ اس خیال پر عمل نہ کرے۔ جب وہ اس کو عمل میں لے آتا ہے تو میں اس کے مثل اس کا گناہ لکھتا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ فرشتے

اللہ تعالیٰ سے عرض کرتے ہیں کہ خدایا تیرا فلاں بندہ برائی کا ارتکاب کرنا چاہتا ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ خود اس بندے کو خوب دیکھ رہا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرشتوں کو حکم دیتا ہے کہ اس بندے پر نگاہ رکھو۔ اگر یہ برائی کا ارتکاب کرے تو اس کے مثل اس کے حساب میں لکھ لو اور اگر ارادہ ترک کردے تو اس کے لئے اسے ایک نیکی شمار کرو۔ اس نے اسے میری خاطر چھوڑا۔"

صحیح مسلم و صحیح بخاری دونوں میں حدیث زیر بحث کی ایک روایت میں 'اذا احسن احدکم اسلامہ' کا اضافہ بھی ہے یعنی فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی شخص اپنے اسلام میں خوب کار ہو تب اس کے لئے اللہ تعالیٰ کا وہ حکم ہے جو روایت میں بیان ہوا۔ جو بندے اسلام کی شرط کو پورا نہیں کرتے ان کے عمل کے بارے میں اس حدیث میں خبر نہیں دی گئی ہے۔ یہ اضافہ نہایت اہم ہے اور اس کی تائید قرآن مجید سے بھی ہوتی ہے۔ سورہ توبہ میں بعض مسلمانوں کی جہاد میں عدم شرکت کے بیان میں فرمایا مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ (توبہ ۹۱) 'خوب کاروں پر کوئی الزام نہیں'۔ یعنی یہ مسلمان اگرچہ اس خاص مہم میں حصہ نہیں لے سکے لیکن اپنے عام رویہ میں چونکہ خوب کار ہیں اس لئے یہ عدم شرکت کے الزام سے بری ہیں۔ معلوم ہوا کہ ایک بندے کا عام رویہ اگر یہ ہو کہ وہ نیکی کا طالب ہو تو وہ بعض معاملات میں اگر عمل میں ناکام بھی ہوتا ہے تو اپنی عمومی نیکی کے باعث کسی قدر الاؤنس کا مستحق ہوتا ہے۔ اس کے برعکس وہ شخص جس کا عام وتیرہ برائی ہی کا ہو وہ کسی الاؤنس کا مستحق نہیں سمجھا جاتا۔

حدیث کا مفہوم

حدیث زیر بحث اور اس کی روایت پر جو اضافے اوپر بیان ہوتے ہیں ان کی روشنی میں حدیث کا سادہ مفہوم مندرجہ ذیل نکات میں بیان کیا جاسکتا ہے:

(ا)۔ اللہ تعالیٰ نے نیک اور بد اعمال کے درمیان حد بندی کردی ہے اور نیک اور بد کے تعین کو بندوں کی اپنی صوابدید پر نہیں چھوڑا۔ اس حد بندی کو حسب ضرورت نہایت واضح کردیا گیا ہے۔

(ب) اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں سے یہ مطالبہ ہے کہ وہ اسلام کو اختیار کریں اور اس پر عمل میں خوب سے خوب تر معیار کو اپنائیں۔

(ج) اسلام میں خوب سے خوب تر معیار اپنانے والوں کے نیک اور بد ارادوں اور ان پر عمل کی جزا کیلئے

اللہ تعالیٰ نے ایک ضابطہ بنا دیا ہے اور فرشتے اس کے مطابق ان کے اعمال کو لکھتے ہیں۔ ضابطہ یہ ہے کہ

- برائی کے محض ارادہ کو جس میں عمل نہ پایا جائے، گناہ نہیں لکھا جاتا۔
- ایک بندہ برائی کا ارادہ خدا کے خوف کے تحت ترک کر دے تو اسے ایک مثبت نیکی لکھا جاتا ہے۔
- برائی کے ارادہ کو عملی جامہ پہنا دیا گیا ہو تو بندے کے حساب میں اس برے کام کا ایک مثل گناہ لکھا جاتا ہے۔
- نیکی کے محض ارادہ پر ایک نیکی کے مثل ثواب لکھا جاتا ہے۔
- نیکی عملاً کرنے پر اس نیک کام کے دس مثل سے لے کر سات سو مثل تک بلکہ اس سے بھی زیادہ نیکی کا ثواب لکھا جاتا ہے۔

اب ہم ان نکات کی بقدر ضرورت وضاحت کرتے ہیں۔

نیک اور بد میں امتیاز

یہ بات کہ اسلام میں نیک اور بد کے درمیان حد بندی کر دی گئی ہے اس دین سے واقف ہر شخص پر نہایت واضح ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نفس انسانی کی تشکیل اس طرح فرمائی ہے کہ اس کے اندر نیکی اور بدی دونوں کا شعور ودیعت فرمایا ہے۔ یہ شعور انسان کی فطرت کے اندر روزِ اوّل سے ہے۔ بندہ جب کوئی غلط کام کرتا ہے تو اسے گناہ کا احساس ہو جاتا ہے جس پر اس کا ضمیر اسے ملامت کرتا ہے۔ برے سے برا آدمی بھی گناہ کو نیکی سمجھ کر نہیں کرتا بلکہ اسے گناہ سمجھتے ہوئے اپنی طبیعت کے فساد سے مغلوب ہو کر کرتا ہے۔ اس کی فطرت کے اندر احترام نیکی ہی کے لئے ہوتا ہے۔ فلسفۂ اخلاق کے ماہرین بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ چند بنیادی نیکیوں کا نیکی ہونا اور چند معروف برائیوں کا برائی ہونا انسان کی فطرت میں راسخ ہے۔ فطرتِ انسانی کے اسی الہام کو اللہ تعالیٰ نے شریعت کا جامہ پہنا دیا تاکہ معاملہ بندے کی اپنی صوابدید پر نہ رہ جائے اور اسے اعمال کے نیک یا بد ہونے کے معاملہ میں کوئی اشتباہ نہ ہو۔ لہٰذا اب نیک و بد کی واضح کسوٹی قرآن مجید اور شریعت اسلامی میں محفوظ ہے۔ اس سے ہٹ کر نیکی اور بدی کا کوئی تصور قائم کرنا درست نہیں۔ زیر نظر حدیث میں جو ضابطہ بیان کیا گیا ہے وہ خدا کے بتائے ہوئے نیک و بد کے بارے میں ہے نہ کہ اس سے ہٹ کر کسی اور معیار پر جانچے ہوئے نیک و بد کے بارے میں۔

بندے کا امتحان اور اسلام کی شرط

اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا فرمایا۔ اس نے اسے بہترین ظاہری اور باطنی صلاحیتیں عطا کیں۔ اسے عقل و فہم، امتیاز اور اختیار و ارادہ جیسی نعمتیں دیں تاکہ یہ اللہ تعالیٰ کی ارضی خلافت کی ذمہ داریوں سے بطریقِ احسن عہدہ برا ہو سکے۔ یہ ذمہ داریاں اسلام کو اختیار کر کے ادا ہو سکتی ہیں۔ اسلام وہ دین ہے جس میں ایک بندہ رب کے ساتھ اپنے تعلق کو صحیح بنیاد پر قائم کر لیتا اور اس کی عبادت و اطاعت پر کمربستہ ہو جاتا ہے۔ چونکہ بندے کو ایسا کرنے یا نہ کرنے کا اختیار حاصل ہے اس لئے اس کا عرصۂ حیات ایک امتحان میں گزرتا ہے۔ وہ چاہے تو اپنی ذمہ داریوں کو سمجھ کر نیکی کی راہ اختیار کرے اور چاہے تو دنیا کی رنگینیوں میں کھو کر اپنے فرائض سے غافل ہو جائے۔ دنیا کی زندگی کے اس امتحان کا نتیجہ آخرت میں ظاہر ہونے والا ہے جب اللہ تعالیٰ اپنے ہر بندے کے اعمال کا محاسبہ کرے گا۔ وہاں یہ کھلے گا کہ کس شخص کے اعمال خدا کی میزان میں بے وقعت ٹھہرے اور کس کے اعمال مثمر ثابت ہوئے۔ قرآن مجید میں یہ حقیقت واضح کر دی گئی ہے کہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کی میزان میں انہی نیک اعمال کا وزن ہو گا جو خدا کے مخلص و مطیع بندوں نے خدا کی شرائط پر کئے ہوں گے اور جن میں اللہ تعالیٰ کی رضا پیش نظر رکھی گئی ہو گی۔ باقی رہے ان لوگوں کے اعمال جو خدا کے ساتھ اپنے تعلق کو صحیح بنیاد پر قائم نہیں کرتے اور ان کا مطمع نظر دنیا ہی کے فوائد ہوتے ہیں خدا کے ہاں ان کی کوئی قدر و قیمت نہ ہو گی۔ وہ قیامت میں راکھ کے اس ڈھیر کی مانند ہوں گے جس پر تیز ہوا چلے اور اسے اڑا کر لے جائے، ایسے اعمال کرنے والوں کو کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔

اللہ تعالیٰ اپنے ان بندوں سے محبت رکھتا ہے جو زندگی کے امتحان میں کامیاب ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لئے اس کا معاملہ ان کے ساتھ احسان پر مبنی ہے جو ربِ کریم کی شانِ کریمی سے مطابقت رکھتا ہے۔ اس کو قرآن مجید میں واضح بھی کر دیا گیا جب فرمایا لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ" (یونس ۲۶) احسان کی روش اختیار کرنے والوں کے لئے اچھا بدلہ ہو گا اور مزید برآں بھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حقیقت کو "اذا احسن احدکم اسلامہ" کے الفاظ سے واضح فرمایا۔ تاکہ معلوم رہے کہ آخرت میں نتیجہ خیز اعمال صرف خوب کاروں کے ہوں گے۔

عمل کی حیثیت اور اس کے بدلہ کا ضابطہ

حدیث میں بیان کردہ اجر کے ضابطہ کو سمجھنے سے قبل خود عمل کی حیثیت کو سمجھنا ضروری ہے۔ دنیا میں بندہ جو عمل کرتا ہے اس کی مثال ایک بیج کی ہے جسے کسان زمین میں بوتا اور اس کا ثمرہ حاصل کرنے کا منتظر ہوتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ بیج کے مثمر ہونے کی کئی شرائط ہیں۔ مثلاً یہ کہ بیج خراب یا گلا سڑا نہ ہو بلکہ صحت مند ہو، اسے نمو کے لئے مناسب ماحول ملے یعنی موسم کاشت کے لئے موزوں ہو، زمین زرخیز ہو اور بیج ڈالنے سے قبل اس کو نرم کر لیا گیا ہو۔ وقت پر فصل کو پانی دیا جائے اور اس کی نگہداشت کی جائے۔ جب تمام حالات سازگار ہوں تو بیج پھوٹتا اور برگ و بار لاتا ہے اور کسان کو اس کی محنت کا صلہ اس کے بیج کی کوالٹی، زمین کی تیاری، مناسب وقت پر آب پاشی اور پودوں کی حفاظت و نگہداشت کے مطابق ملتا ہے۔

بیج اگر ناقص ہو تو وہ بہترین سازگار حالات میں بھی برگ و بار لانے سے قاصر رہتا ہے اور بیج اچھا ہو لیکن سازگار حالات اسے میسر نہ آئیں تو اگرچہ وہ پھل لاتا ہے لیکن پیداوار کی مقدار کم ہوتی ہے۔

نیک عمل جو خدا کی شرائط پر کیا جائے ایک صحت مند بیج ہے جس کے اجر کی کم سے کم شرح اس کے دس مثل کے برابر ہے۔ بندہ جب اسے صحیح وقت پر کرے، اس کے لئے مشقت اٹھائے، کم وسائل رکھتے ہوئے ایثار سے کام لے، اس کے احساسات خوش دلی اور فائز المرامی کے ہوں نہ کہ تنگ دلی اور مجبوری کے، تو اس کا صلہ اس عمل کی نسبت بہت بڑھ جاتا ہے جو اگرچہ صحیح ہو لیکن اس کے کرنے میں بندے کو زیادہ مشقت نہ اٹھانی پڑے یا اس کے احساسات و جذبات میں کوئی کمی رہ جائے۔ انفاق فی سبیل اللہ کے ضمن میں قرآن مجید نے بیج کی تمثیل بیان کر کے یہ واضح کیا ہے کہ نیک عمل اپنے سے سات سو گنا یا اس سے بھی زیادہ اجر لائے گا۔ فرمایا

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ (بقرہ - ۲۶۱)	ان لوگوں کی تمثیل جو اللہ کی راہ میں انفاق کرتے ہیں یوں ہے جیسے ایک دانہ جو سات بالیاں نکالے جن میں سے ہر بالی میں ایک سو دانے ہوں۔ اللہ اس سے زیادہ کرے گا جس کے لئے چاہے گا اور اللہ وسعت والا علم والا ہے۔

ہر برا عمل ایک ناقص بیج ہے جو کوئی پیداوار نہیں لا سکتا البتہ کاشت کار کی محنت کو رائیگاں کر سکتا ہے۔

عمل نیک ہو یا بد، اس کے وجود میں آنے سے پہلے اس کا ارادہ پایا جاتا ہے۔ زیر بحث حدیث نے ارادہ اور عمل دونوں کے اس نتیجہ کی خبر دی ہے جو آخرت میں بندوں کے سامنے آئے گا۔

ایک بندے کے دل میں جب کوئی برائی کرنے کا خیال آتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں کو حکم دیتا ہے کہ وہ اس بندے پر نگاہ رکھیں۔ اگر وہ اسے عمل میں نہ لائے تو محض برے خیال کو اس کی برائی نہ لکھا جائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ حد بھی بتادی جہاں تک ایک برا خیال محض خیال سمجھا جاتا ہے اور اس کے بعد اسے برے عمل کے طور پر لکھا جاتا ہے۔

عن ابی هريرة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ان الله عز وجل تجاوز لامتى عما حدثت به انفسها مالم تعمل او تكلم به (مسلم۔ باب تجاوز الله عن حديث النفس)	ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے میری امت کے محض خیالات سے درگزر فرمایا ہے جب تک ان پر عمل نہ کیا جائے یا ان کے بارے میں زبان نہ کھولی جائے۔

یعنی دل میں آنے والے وسوسہ پر صرف اس وقت گرفت ہوگی جب آدمی اس کو اپنے قول یا فعل کا موضوع بنائے۔ اس راہ میں وہ جتنی پیش قدمی کرتا جائے گا، خدا کے ہاں اس کے گناہ کی مقدار اسی قدر بڑھتی جائے گی۔

جب گناہ کا دل میں خطور ہو لیکن آدمی اس پر متنبہ ہو جائے اور خدا کے خوف سے اس خیال کو دل سے نکال دے تو یہ ایک مومنانہ کردار ہے جسے ایک نیکی لکھا جاتا ہے۔ کیونکہ اس کی حیثیت توبہ کی طرح ہے جس میں آدمی خدا کی طرف رجوع کر کے ایک گناہ سے باز آجاتا ہے۔ جب توبہ ایک مثبت نیکی ہے تو خدا کے خوف سے ایک برے خیال کو دل سے نکال دینا کیوں نیکی نہ ہوگا۔ لہذا اللہ تعالیٰ فرشتوں کو حکم دیتا ہے کہ بندہ اگر میرے خوف سے اپنے برے ارادے سے باز آجائے تو اسے ایک مثبت نیکی شمار کرو۔

عملاً برائی کرنے پر اللہ تعالیٰ بندے کے حساب میں اس کے عمل کے مثل گناہ لکھ دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب آدمی اپنے خیال کا کسی سے تذکرہ کرے گا، اس کو عملاً کرنے کی تجویزیں سوچے گا، اس کے لئے منصوبے بنائے گا اور عملی اقدامات کرے گا تو ان میں سے ہر کام گناہ ہوگا جس کا خمیازہ اسے بھگتنا پڑیگا۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں برائی کے مثل جو گناہ لکھا جاتا ہے اس کو معمولی چیز سمجھ لینا ایک غلطی ہے۔ ہمیں دنیا میں کسی فعلِ بد کے اثرات یا نتائج کا صحیح علم نہیں ہونے پاتا۔ ایک مضمون نگار چند صفحے لکھ دیتا ہے لیکن ان کے اندر فطرت کے خلاف بغاوت اور حق کی تضحیک کا ایسا سامان رکھ دیتا ہے کہ لاکھوں افراد اس سے متاثر ہو کر غلط روش اختیار کر لیتے ہیں تو اس مضمون نگار کے گناہ کا مثل آخرت میں ان لاکھوں افراد کی ضلالت کے بقدر ہوگا۔

ایک شخص عدالت میں جھوٹی گواہی دے دیتا ہے جس کے نتیجہ میں ایک آدمی اور اس کی اولاد اپنے جائز حق سے محروم ہو جاتی ہے تو اس شخص کے گناہ کا مثل وہ تمام حق تلفیاں ہوں گی جو اس کی جھوٹی گواہی کے باعث وجود میں آئیں اگرچہ ان میں اور اس شخص میں بہت بڑا زمانی بُعد واقع ہو چکا ہو۔ اس لئے نیکی کے کئی گنا اجر کے تقابل میں برائی کے ایک مثل گناہ لکھے جانے کی خبر سے برائی پر جری ہو جانا نہایت درجہ کی ناعاقبت اندیشی ہے۔

جہاں تک نیکی کے ارادہ پر ایک نیکی لکھے جانے کا تعلق ہے یہ بات عین قرینِ قیاس ہے۔ کیونکہ نیکی کا ارادہ کر کے بندہ شیطان کو شکست دے کر نیکی کی راہ میں اپنے نفس کی پہلی رکاوٹ کو عبور کر لیتا ہے اور امتحان کے اس مرحلہ میں کامیاب ہو کر اپنے ارادہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی فکر میں لگ جاتا ہے۔ اس مرحلہ کی کامیابی کی اللہ تعالیٰ قدر فرماتا ہے۔ اس نے بندوں کی عملی نیکی پر دس مثل اجر جو مقرر کیا ہے تو یہ بندوں پر اس کا فضل خاص ہے، جیسا کہ اوپر واضح کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بات راز نہیں رہنے دی بلکہ واضح طور پر قرآن مجید میں فرما دی۔

مَنْ جَاۗءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا	جو نیکی کرے گا اُس کے لئے اس کے دس مثل اجر
وَمَنْ جَاۗءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا	ہے اور جو برائی کرے گا تو ایسے لوگوں کا اسی برائی کا
مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (انعام ۱۶۰)	مثل بدلہ ہوگا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

یہاں یہ بات یاد رہنی چاہیئے کہ نیکی کے لئے ایک بندے کے عزم راسخ کے باوجود اگر مشیت الٰہی

اس کے عمل میں مزاحم ہو جاتی ہے اور بندہ وہ نیکی نہیں کر پاتا تو بندے کو اس کی نیت اور عزم کے مطابق عمل کا پورا پورا صلہ ملتا ہے۔ غزوہ تبوک میں جو صحابہؓ اپنی غربت کے باعث جنگی تیاری میں حصّہ نہ لے سکے تھے، آنحضرتؐ انہیں مدینہ ہی میں چھوڑ گئے۔ ان کے شدتِ تاثر کا یہ حال تھا کہ اپنی محرومی پر ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ وہ افسوس کرتے تھے کہ کاش ان کے پاس بھی کچھ ہوتا جو وہ راہ حق میں قربان کر دیتے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی کہ مجاہدین کا لشکر جس جس وادی سے بھی گزرا یہ محروم صحابہؓ ان کے ساتھ تھے۔ اس لئے کہ ان کا تخلّف ان کے اپنے ارادے سے نہ تھا بلکہ اللہ تعالیٰ ہی نے انہیں وسائل سے محروم رکھا جس کے سبب سے وہ اپنے ارادہ کو عملی جامہ نہ پہنا سکے۔ لیکن عمل کا جوہر چونکہ نیت اور عزم راسخ ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان صحابہؓ کو بھی شریک جہاد قرار دیا۔ اس واقعہ سے یہ نتیجہ بھی مستنبط ہوتا ہے کہ اگر ایک شخص کے دل میں کسی برے عمل کے لئے عزم راسخ ہو اور وہ اسے عملی جامہ پہنانے کے لئے کوشاں ہو لیکن اس کے عزم اور عمل میں اللہ تعالیٰ کی مشیت حائل ہو کر اسے یہ برا کام نہ کرنے دے تو وہ شخص اس ناکردہ گناہ کا مجرم شمار ہو جائے گا اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ شخص اپنے تمام وسائل بروئے کار لا چکا۔ اگر خدا اسے مہلت عطا کرتا تو اس کا ارادہ برے کام کی تکمیل میں حائل نہ ہوتا۔

بقیہ: تعلق باللہ اور اس کی اساسات

ہو جاتا ہے جس میں یہود مبتلا ہو گئے کہ وہ جرائم پر جرائم کرتے چلے جاتے اور سمجھتے کہ سَیُغْفَرُ لَنَا (الاعراف - ۷: ۱۶۹) (ہمارے لئے سب معاف کر دیا جائے گا) یعنی ہم خدا کے برگزیدوں کی اولاد ہیں، جس طرح اب تک اس نے درگزر فرمایا ہے اسی طرح آئندہ بھی درگزر فرمائے گا۔ اسی رجائیت کے بطن سے مرجئیت بھی پیدا ہوتی ہے جو اس دور کا عام دین ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ مغفرت حاصل کرنے کے لئے چند باتوں کا زبانی اقرار کافی ہے۔ اعمال کی اہمیت ان کے نزدیک اول تو کچھ ہے نہیں اور اگر ہے بھی تو بہرحال اتنی نہیں ہے کہ ان کے اوپر نجات کا انحصار ہو۔

امین احسن اصلاحی

تعلق باللہ اور اس کی اساسات

خوف

جس طرح اللہ تعالیٰ کی محبت ایمان کے لازمی مقتضیات و مطالبات میں سے ہے اسی طرح خوف بھی اس کے بدیہی مطالبات میں سے ہے اور جس طرح ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت دوسری تمام محبتوں پر غالب و حاکم ہو اسی طرح یہ بھی واجب ہے کہ خدا کا خوف دوسرے تمام خوفوں پر غالب و حاکم ہو۔ چنانچہ قرآن نے جس طرح فرمایا ہے کہ اہل ایمان اللہ تعالیٰ کی محبت میں سب سے زیادہ سخت ہوتے ہیں — وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ (البقرۃ ۲: ۱۶۵) (جو خدا پر ایمان رکھتے ہیں وہ سب سے زیادہ خدا سے محبت رکھنے والے ہوتے ہیں) — اسی طرح ان لوگوں کو جن کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کے سوا دوسروں کے ڈر سمائے ہوئے تھے تنبیہ فرمائی کہ:۔

أَتَخْشَوْنَهُمْ ۚ فَاللَّهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشَوْهُ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ (التوبۃ ۹: ۱۳)
کیا تم ان سے ڈرو گے؟ اصلی حقدار تو اللہ ہے کہ تم اس سے ڈرو اگر تم واقعی مومن ہو۔

إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي (البقرۃ ۲: ۱۵)
مگر جو ان میں سے ظالم ہیں تو ان سے نہ ڈرو، مجھی سے ڈرو۔

اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کی وجہ:۔

اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ العیاذ باللہ وہ مشرکین کے خیالی بھوتوں کی طرح کوئی ہولناک اور ڈراونی چیز ہے کہ ذرا ناخوش ہو جائے تو سب کو تباہ و پامال کر کے رکھ دے۔ اس نے اپنی جو صفتیں قرآن میں بتائی ہیں، وہ سب اچھی، جمیل اور دل کو طمانیت بخشنے والی ہیں۔ بعض صفتیں اس کے جلال و جبروت کو ظاہر کرنے والی ضرور ہیں، لیکن ان کی صحیح نوعیت ہم نے اپنی تفسیر — تدبر قرآن — میں واضح

کر دی ہے کہ یہ اس کی عظمت و قدرت کی بے پناہی اور اس کے حیطۂ قدرت کی ہمہ گیری کے اظہار کے لئے ہے تاکہ اہل ایمان کو ان سے پورا اعتماد حاصل ہو، اہل کفران سے عبرت اور تنبیہ حاصل کریں۔ ان سے یہ تاثر لینا کہ اللہ تعالیٰ کوئی خوفناک چیز ہے، ان کی روح کے بالکل منافی بات ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ کی صفاتِ جمیلہ کے جو تقاضے ہیں اور ان سے جو سنن و قوانین ظہور میں آئے ہیں وہ بجائے خود ایسے اہم، اٹل اور بے پناہ ہیں کہ جو شخص بھی ان کا علم رکھتا ہے وہ لازماً اللہ تعالیٰ سے ڈرتا اور سب سے زیادہ ڈرتا ہے۔

یہ صفات اور ان کے تقاضے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں نہایت تفصیل سے بیان کر دیئے ہیں جو لوگ قرآن سے نابلد ہیں وہ تو بے شک بے خوفی کی زندگی بسر کرتے ہیں لیکن جو اس سے آشنا ہیں ان کا حال خود اس کتاب ہی میں بیان ہوا ہے کہ تَتَجَافَىٰ جُنُوبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَطَمَعًا (السجدۃ ۳۲: ۱۶) (ان کے پہلو بستروں سے کنارہ کش رہتے ہیں۔ وہ اپنے رب کو پکارتے ہیں خوف اور طمع سے)، جو قدم وہ اٹھاتے ہیں یہ اچھی طرح سوچ کر اٹھاتے ہیں کہ ایک دن ان کو اپنے مالک کے آگے ہر قول و فعل کا حساب دینا ہے۔ چنانچہ یہ بات قرآن میں نہایت وضاحت سے بیان ہوئی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے حقیقی ڈرنے والے اس کے بندوں میں سے وہی ہوتے ہیں جو اس کی کتاب کا علم رکھنے والے ہیں۔ فرمایا:۔

إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ غَفُورٌ (فاطر ۳۵: ۲۸)
اللہ سے اس کے بندوں میں سے وہی ڈریں گے جو علم رکھنے والے ہیں۔ بیشک اللہ غالب اور بخشنے والا ہے۔

اس آیت میں 'علماء' سے مراد ظاہر ہے کہ اصطلاحی علماء نہیں ہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول کے عطا کئے ہوئے حقیقی علم کے وارث ہیں۔ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی صحیح صفات اور اس کے سنن اور قوانین سے اچھی طرح آگاہ ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے وہ اس سے اس طرح ڈرتے ہیں جس طرح اس سے ڈرنے کا حق ہے۔ رہے وہ لوگ جو نہ اس کی صفات ہی سے واقف ہیں اور نہ اس کے سنن و قوانین ہی سے، ان لوگوں کے لئے نہ اس سے ڈرنے کی کوئی وجہ ہے نہ وہ ڈرتے ہی ہیں اور اگر ڈرتے بھی ہیں تو اس طرح نہیں ڈرتے جس طرح

اللہ تعالیٰ سے ڈرنا چاہیئے۔ بلکہ اس طرح ڈرتے ہیں جس طرح ایک بت پرست اپنے خیالی بھوت سے ڈرتا ہے۔ درآنحالیکہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کے لئے قرآن نے یہ شرط لگائی ہے کہ اس سے اس طرح ڈرو جس طرح اس سے ڈرنے کا حق ہے، يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ (آل عمران۔ ۳ : ۱۰۲)، اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے، مسئلہ کا یہ پہلو تقاضا کرتا ہے کہ قرآن کی روشنی میں ہم خوفِ الٰہی کے چند پہلو واضح کریں تاکہ ان لوگوں کو ان سے رہنمائی حاصل ہو جو صحیح علم کے طالب ہیں۔

خوفِ الٰہی کے اصلی محرکات:۔ قرآن نے اللہ تعالیٰ سے برابر ڈرتے رہنے کے جو وجوہ تفصیل سے بیان کئے ہیں ان میں سے سب سے پہلی وجہ، جس کی بار بار وضاحت فرمائی ہے، یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حکیم ہے اور اس نے یہ دنیا ایک عظیم حکمت و غایت کے ساتھ پیدا کی ہے۔ اس کی اس حکمت کا بدیہی تقاضا ہے کہ وہ ایک ایسا دن لائے جس میں ان لوگوں کو ان کی نیکیوں کا صلہ دے جو اس دنیا میں نیکی اور پرہیزگاری کی زندگی گزاریں اور ان لوگوں کو قرارِ واقعی سزا دے جو دھاندلی اور فساد مچائیں۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو اس کے معنی یہ ہوتے کہ اس کے نزدیک نیکی اور بدی میں سرے سے کوئی فرق نہیں ہے اور وہ اس امر سے بالکل بے تعلق ہے کہ کون اس کی دنیا میں تقویٰ اور پرہیزگاری کی زندگی گزارتا ہے اور کون نافرمانی اور بغاوت کی۔ یہ فرض کرنا اللہ تعالیٰ کی صفاتِ رحمت، ربوبیت، عدل اور قدرت و حکمت کی کلی نفی ہے۔ چنانچہ قرآن نے قیامت کے منکروں کو خطاب کر کے جگہ جگہ یہ فرمایا ہے کہ کیا تم نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ ہم نے تم کو عبث پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف لوٹائے نہیں جاؤ گے؟ یا یہ سوال کیا ہے کہ کیا تم نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ جو علم والے ہیں وہ اور جو علم سے محروم ہیں وہ، دونوں یکساں ہو جائیں گے؟ مطلب یہ ہے کہ اگر قیامت نہیں ہے، جیسا کہ تم گمان کرتے ہو، تو اس کا نتیجہ تو یہ نکلتا ہے کہ نیک اور بد اور عالم و جاہل، دونوں یکساں ہو جائیں اور یہ دنیا ایک کھلنڈرے کا کھیل اور ایک بازیچۂ اطفال بن کے رہ جائے۔ اگر یہ فرض کرنے کی گنجائش نہیں ہے اور ظاہر ہے کہ نہیں ہے تو ہر عاقل پر یہ واجب ہے کہ وہ خدا کی پکڑ اور اس کے عذاب سے بچنا چاہتا ہے تو اس کے حضور پیشی سے برابر ڈرتا

رہے اور اپنی خواہشوں کو لگام دے اس گروہ کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا ہے:

وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَٰذَا بَاطِلًا سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ (آل عمران۔ ۳ : ۱۹۱)

یہ لوگ آسمانوں اور زمین کی خلقت پر غور کرتے رہتے ہیں۔ ان کی دعا یہ ہوتی ہے کہ اے پروردگار! تو نے یہ کارخانہ بے مقصد نہیں پیدا کیا ہے۔ تو اس بات سے پاک ہے کہ کوئی عبث کام کرے سو تو ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا۔

رہے وہ لوگ جو اس دنیا کو ایک بازیچۂ اطفال اور اس کے خالق کو العیاذ باللہ ایک کھلنڈرا گمان کر کے اپنی زندگی بے خوفی میں گزار رہے ہیں لازم ہے کہ ایک دن وہ اپنی اس حماقت کا انجام دیکھیں۔

دوسری وجہ خدا سے ڈرنے کی یہ ہے کہ جو پکڑ وہ پکڑ سکتا اور جو سزا وہ دے سکتا ہے کوئی دوسرا، خواہ کتنا ہی بڑا بادشاہ اور کتنا ہی بڑا جبار ہو، نہ وہ اس طرح پکڑ سکتا اور نہ ہی اس کی طرح کسی کو سزا دے سکتا چنانچہ اس نے خود اپنی تعریف یہ فرمائی ہے کہ لَا يُعَذِّبُ عَذَابَهُ أَحَدٌ ۝ وَلَا يُوثِقُ وَثَاقَهُ أَحَدٌ (الفجر۔ ۸۹ : ۲۵-۲۶) (نہ اس کا سا کوئی عذاب دے سکتا اور نہ اس کا سا باندھنا کوئی باندھ سکتا) اس کی وجہ ظاہر ہے کہ کوئی بڑے سے بڑا جبار بھی کسی کو بڑی سے بڑی سزا جو دے سکتا ہے وہ بہرحال اسی دنیا کی زندگی تک محدود ہو گی اگر کوئی دوسرا نہیں تو موت آکر اس کو اس زندگی اور اس کے عذاب دونوں سے نجات دے سکتی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ جو عذاب دے گا وہ ایک ابدی زندگی میں ہو گا جس کو نہ کوئی ختم کر سکتا اور نہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اس کی کلفتوں سے نجات دلا سکتا یا اس میں کوئی تخفیف ہی کر سکتا دوسروں کی گرفت یا ان کے دائرۂ اقتدار سے بچ نکلنا بھی ناممکن نہیں ہوتا لیکن اللہ تعالیٰ کی خدائی آسمانوں اور زمین کے ایک ایک گوشہ پر محیط ہے۔ ان کی حدود سے باہر نکل بھاگنا کسی کے لئے بھی ممکن نہیں ہے، نہ کسی جن کے لئے نہ کسی انسان کے لئے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے جنوں اور انسانوں دونوں کو مخاطب کر کے آگاہ فرمایا ہے کہ

يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا ؕ لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ ۚ (الرحمٰن ـ ۵۵ : ۳۳)

اے جنوں اور انسانوں کے گروہ، اگر تم یہ کر سکو کہ نکل بھاگو آسمانوں اور زمین کے اطراف سے تو نکل بھاگو۔ تم میرے پروانۂ راہداری کے بدون نہیں نکل سکو گے۔

دنیا کے قہاروں اور جباروں کے سراغرسانوں اور ان کی پولیس سے بچ نکلنے کی سو تدبیریں ہو سکتی ہیں۔ سائنس کی اس ترقی کے زمانے میں بھی آئے دن ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں کہ مضبوط سے مضبوط جیلوں کے اندر اور ہوشیار سے ہوشیار پہرہ داروں کی نگرانی سے بھی بھاگنے والے بھاگ ہی جاتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کا فرشتۂ اجل ایسا بے پناہ ہے کہ کوئی اس کے پنجہ سے کسی طور بھی چھوٹ نہیں سکتا اور اس کی رسائی مضبوط سے مضبوط قلعوں کے اندر بھی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے مجرموں کے لئے جو جیل بنائی ہے اس پر اس نے ایسے سخت گیر ملائکہ مامور کئے ہیں جو کسی کی آہ و فریاد سے متاثر ہو کر نہ ذرا اس پر ترس کھائیں گے نہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل میں ذرا چشم پوشی برتیں گے۔ عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ (التحریم ـ ۶۶ : ۶) (اس پر درشت مزاج اور سخت گیر ملائکہ مامور ہوں گے۔ اللہ ان کو جو حکم دے گا اس کی تعمیل میں وہ اس کی نافرمانی نہیں کریں گے)

اس معاملہ کا تیسرا پہلو جو مذکورہ دونوں باتوں سے بھی اہم ہے یہ ہے کہ اس دنیا میں فدیہ، رشوت اور سفارش سے بھی بہت سے کام نکل آتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کی گرفت سے بچنے کے لئے یہ حربے بھی بے سود ہیں۔

جہاں تک فدیہ اور رشوت کا تعلق ہے، اوّل تو کسی کے پاس وہاں کوئی چیز ہوگی ہی نہیں اور ہو بھی تو وہ کس کو فدیہ یا رشوت دے گا؟ کیا العیاذ باللہ اللہ تعالیٰ کو؟ اس دن کے ہولناک عذاب سے چھوٹنے کے لئے مجرمین چاہیں گے تو ضرور کہ اپنی عزیز سے عزیز چیز بھی فدیہ میں دے کر عذاب سے چھوٹ سکیں تو اپنے کو چھڑا لیں لیکن ان کی یہ تمنا پوری نہیں ہوگی۔ وہ دن جزائے اعمال سے دوچار ہونے کا ہوگا۔ عمل ہی چھڑائے گا اور عمل ہی سزا دلوائے گا۔ كُلُّ امْرِیٴٍۢ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ (الطور ـ ۵۲ : ۲۱) (ہر ایک اس کمائی کے بدلے میں گرو

ہوگا جو اس نے کی ہوگی)۔ اس دن مجرمین کی بے بسی اور بے کسی کا حال قرآن نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:-

يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِيْ مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍۢ بِبَنِيْهِ ۙ وَصَاحِبَتِهٖ وَاَخِيْهِ ۙ وَفَصِيْلَتِهِ الَّتِيْ تُـْٔوِيْهِ ۙ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۙ ثُمَّ يُنْجِيْهِ ۙ كَلَّا ؕ (المعارج ـ ۷۰ : ۱۱ ـ ۱۵)

مجرم تمنا کرے گا کہ کاش! اس دن کے عذاب سے چھوٹنے کے لئے اپنے بیٹوں، اپنی بیوی، اپنے بھائی اور اپنے اس کنبہ کو جو اس کو پناہ دیتا رہا ہے اور تمام اہل زمین کو فدیہ میں دے کر اپنے کو بچا لے لیکن ان کی یہ تمنا ہرگز بر نہیں آئے گی۔

نادانوں نے اس دن کے عذاب سے چھوٹنے کے لئے سب سے زیادہ اعتماد اپنے فرضی معبودوں اپنے پیروں، اپنے مشائخ اور ولیوں اور نبیوں کی سفارش پر کیا ہے۔ جس طرح مشرکین عرب اس وہم میں مبتلا تھے کہ اپنے جن دیویوں، دیوتاؤں کی وہ پرستش کرتے ہیں ان کو خدا کے ہاں وہ مقام حاصل ہے کہ وہ اپنے پجاریوں کو اپنے زور و اثر سے، خدا کی پکڑ سے بچا لیں گے اسی طرح اس دور کے کتنے مسلمان اپنے پیروں اور مشائخ کے متعلق یہ گمان رکھتے ہیں کہ وہ ان کو ساتھ لئے بغیر تنہا جنت میں نہیں جائیں گے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ ان کی دل داری میں انکے تمام متوسلین کو جنت میں ضرور بھیجے گا۔ قطع نظر اس سے کہ ان کے عقائد و اعمال کیا ہیں۔ گویا اصل چیز ان کے نزدیک، نجات کے لئے اللہ اور رسول سے تعلق نہیں، بلکہ کسی مزار اور صاحب مزار سے توسل ہے۔ ان کی سفارش کی امید نے ان کو دین کی تمام ذمہ داریوں سے فارغ کر دیا ہے۔ اس طرح کے لوگوں کو خبر نہیں ہے کہ شفاعت کے باب میں اللہ تعالیٰ کے احکام و قوانین کیا ہیں، ورنہ وہ اپنی عاقبت اس طرح خطرہ میں نہ ڈالتے۔ ہم قرآن کی روشنی میں چند اہم باتیں یہاں بیان کرتے ہیں تاکہ اس طرح کے بے خبروں کو آگاہی حاصل ہو۔

سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ خدا کے حضور میں ناز اور تدلّل سے بات کرنا تو درکنار کوئی شخص اس کے اذن کے بغیر زبان کھولنے کی جرأت ہی نہیں کر سکے گا۔ صرف وہی زبان کھولے گا جس کو اجازت مرحمت ہوگی۔ اس پابندی سے کوئی بھی مستثنیٰ نہیں ہے مقرب ترین

فرشتوں کے متعلق بھی قرآن میں بیان ہوا ہے کہ "لَا یَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ (وہ اس کے آگے بات میں پہل نہیں کرتے)، یعنی جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے اذن نہ ہو جبریل امینؑ بھی زبان نہیں کھولتے۔ تو تا بہ دیگراں چہ رسد! ایسی بات جگہ جگہ نبیوں اور رسولوں کے متعلق ارشاد ہوئی ہے۔ تو کسی پیر یا شیخ سے متعلق یہ بات کیسے باور کی جا سکتی ہے کہ وہ پہل کر کے اللہ تعالیٰ سے کوئی بات ناز و تدلل سے کہنے کی جرأت کر سکے گا۔

دوسری بات یہ ہے کہ جس کو بات کرنے کی اجازت ملے گی وہ صرف اس شخص کے بارے میں بات کرے گا جس کے لئے اس کو اجازت ملے گی۔ مجال نہیں ہے کہ وہ اس کے علاوہ کسی دوسرے کے باب میں لب کشائی کر سکے۔ اس کی وضاحت بھی قرآن نے ان الفاظ میں کر دی ہے۔ وَلَا یَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ (الانبیاء ۲۱:۲۸) (اور وہ شفاعت نہیں کریں گے مگر صرف اس کے لئے جس کے لئے اللہ پسند فرمائے اور وہ اس کی خشیت سے لرزاں رہتے ہیں)

تیسری حقیقت یہ ہے کہ یہ صرف وہی بات کہے گا جو حق ہوگی۔ کوئی خلافِ حقیقت بات زبان سے نکالنے کی جرأت نہیں کرے گا۔ اللہ تعالیٰ ہر شخص کے بارے میں سب سے زیادہ خود جانتا ہے۔ کوئی شخص اس پوزیشن میں نہیں ہو سکتا کہ کسی کے متعلق وہ یہ کہہ سکے کہ وہ اس کے بارے میں خدا سے زیادہ جانتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا علم سب کو محیط ہے۔ دوسروں کو صرف اتنا ہی علم ہے جتنا اس نے بخشا ہے۔ اس وجہ سے کسی کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ خدا کے سامنے دروغ بیانی کر سکے۔

چوتھی حقیقت یہ ہے کہ کوئی سفارش نہ حق کو باطل بنا سکتی اور نہ باطل کو حق۔ اگر ایسا ہو تو اس سے وہی بات لازم آتی ہے کہ جو قیامت کے نہ ہونے سے آتی ہے یعنی یہ دنیا ایک کھلنڈرے کا کھیل بن کے رہ جاتی ہے جو ایک حکیم خدا کی صفات اور شان کے منافی ہے۔

پانچویں یہ کہ اللہ تعالیٰ نے نجات کو کلیۃً آدمی کے اعمال اور اپنی رحمت سے وابستہ کیا ہے نہ کہ کسی کی سفارش سے۔ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ (الزلزال ۹۹: ۷-۸) (پس جس نے ذرہ برابر بھی نیکی کی ہوگی وہ بھی اس کو

دیکھے گا اور جس نے ذرا برابر بدی کی ہوگی وہ بھی اسے دیکھے گا۔)

ان کلیات کی روشنی میں یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ شفاعت کا دائرہ اتنا کشادہ نہیں ہے جتنا اپنی خواہشوں کو الاؤنس دینے والوں نے سمجھ رکھا ہے، بلکہ یہ بہت محدود ہے۔ اس سے فائدہ انہیں لوگوں کو پہنچے گا جو اللہ تعالیٰ کے قانون عدل کے تحت اس سے فائدہ اٹھانے کے حقدار ہوں گے۔ یہ نہیں ہوگا کہ یہ اس عدل و قسط کو باطل کر دے جس پر تمام شریعت، بلکہ تمام نظام عالم کی بنیاد ہے۔

زندگی پر خوفِ الٰہی کے اثرات:- جو شخص قرآن میں اللہ تعالیٰ کی صفاتِ جلال و جبروت پر، کائنات میں خالق کی بے پناہ قدرت و عظمت پر اور قوموں کی تاریخ میں اس کے عدل و قسط کے ظہور کی نشانیوں پر غور کرتا ہے تو بعض اوقات اس پر ایسی ہیبت و دہشت طاری ہو جاتی ہے کہ زندگی کی ہر لذت تلخ معلوم ہونے لگتی ہے لیکن یہ ہیبت و دہشت عقل و فکر کی راہ سے آتی ہے۔ اس وجہ سے تو عقل کو مختل و ماؤف کرتی نہ اس سے انسان پر اس طرح کا اثر پڑتا جس طرح کا اثر اچانک کسی درندہ یا خوفناک سانپ کو دیکھ لینے سے پڑتا ہے کہ آدمی بھاگ کھڑا ہو اور پھر مڑنے کا نام بھی نہ لے بلکہ اس کا اثر یہ پڑتا ہے کہ وہ خدا سے ڈر کر خدا ہی کی طرف بھاگتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جانتا ہے کہ خدا کی پکڑ سے خدا ہی پناہ دے سکتا ہے، کوئی دوسرا نہیں دے سکتا۔ چنانچہ وہ جیسا کہ حدیث ماثور میں ہے: اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ مِنْكَ (اے رب میں تجھ سے تیری ہی پناہ چاہتا ہوں) کہتا ہوا اس طرح اپنے آپ کو اپنے رب کی پناہ میں دے دیتا ہے، جس طرح بچہ ماں کے ڈرانے سے ماں ہی کی آغوش سے چمٹ جاتا ہے۔ جو لوگ خدا سے بھاگ کر کسی دوسرے کی پناہ ڈھونڈتے ہیں وہ وہی غلطی کرتے ہیں جو حضرت نوحؑ کے بیٹے نے کی۔ جب باپ نے اس کو قہر الٰہی سے بچانے کے لئے کشتی میں سوار ہو جانے کی دعوت دی تو وہ گھمنڈ سے بولا کہ میں کسی پہاڑ کی پناہ لے لوں گا جو مجھے اس طوفان سے بچائے گا، لیکن اس کی یہ توقع پوری نہیں ہوئی۔ خدا کی پکڑ سے کوئی پہاڑ بھی پناہ نہیں دے سکتا۔

اس تاثر کا ایک دوسرا پہلو اس سے بھی زیادہ قیمتی ہے کہ یہ ایک ہی خوف دوسرے تمام خوفوں اور اندیشوں سے بالکل بےخوف کر دیتا ہے۔ بندہ خدا سے ڈر کر جب اپنے تئیں اسی کی پناہ میں دے دیتا ہے تو اس کو یہ اطمینان حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ اس کی پناہ میں ہے جس کے سوا نہ کوئی نافع ہے نہ کوئی ضار۔ وہ جو کچھ دینا چاہے گا اس کو کوئی روک نہیں سکتا اور جو روکے گا کوئی اس کو دے نہیں سکتا۔ یہ اطمینان جس کو حاصل ہو گیا اس کو اس دنیا میں آسمانی بادشاہی حاصل ہو گئی۔ جنت کی تعریف میں فرمایا ہے کہ اس میں نہ کوئی خوف ہو گا نہ کوئی غم۔ یہی حال اس دنیا میں اس شخص کا ہوتا ہے جس کا دل اللہ تعالیٰ کے خوف سے آشنا ہو گیا۔ یہ خوف تو اس کو بےشک لاحق رہتا ہے کہ ایک دن اس کو اپنے رب کے حضور اپنے اعمال کی جواب دہی کرنی ہے لیکن یہ خوف دل کو توڑنے والا نہیں بلکہ اس کے لئے سرمایۂ اطمینان و تسکین ہے۔ اس لئے کہ یہ دوسرے تمام وہمی اندیشوں کو یک قلم ختم کر دیتا ہے۔

خوفِ الٰہی کے یہ صرف دو نمایاں اثرات ہم نے بیان کئے ہیں۔ قرآن و حدیث میں اس کے اثرات کی جو تفصیل بیان ہوئی ہے وہ اتنی طویل ہے کہ اس مختصر مضمون میں اس کو سمیٹنا ممکن نہیں ہے۔ ہم اس کو چند کلیات کے تحت بیان کرتے ہیں۔ امید ہے کہ قارئین ان کے تحت ان جزئیات کا بھی احاطہ کرنے کی کوشش کریں گے جو ان کے اندر مضمر ہیں۔

قرآن و حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خوف لازماً انسان کو اس کی شخصی و ذاتی زندگی میں متقی، اس کی عائلی و خاندانی زندگی میں مشفق اور اس کی اجتماعی زندگی میں ایک مصلح بنا دیتا ہے اور یہ اس کے ایسے بدیہی اثرات ہیں کہ اگر یہ کسی میں نہ پائے جائیں یا کامل طور پر نہ پائے جائیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کا سینہ یا تو خوفِ خدا سے خالی ہے اگرچہ وہ اس کا کتنا ہی مدعی ہو یا وہ خدا اور اس کے خوف کے تصور سے بالکل ناآشنا ہے۔

اب اس اجمال کی وضاحت کے طور پر چند باتیں ذہن نشین کر لیجئے۔ اپنی شخصی و انفرادی زندگی میں متقی کا مفہوم یہ ہے کہ وہ مخفی سے مخفی گوشوں میں بھی خدا کے حدود و محارم کی پوری پوری نگہداشت کرتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ جہاں اس کو کوئی نہیں دیکھتا وہاں بھی خدا کی نگاہوں سے وہ مخفی نہیں ہوتا۔ اس وجہ سے وہ کہیں بھی اپنی خواہشوں کو ایسی آزادی نہیں دیتا کہ وہ اللہ تعالیٰ

کی مقرر کی ہوئی کسی حد سے تجاوز کر پائیں۔ اس کے برعکس اس میں احتیاط کی یہ شان نمایاں ہوتی ہے کہ وہ صرف برائی ہی سے نہیں بلکہ برائی کے قرب سے بھی اپنے کو بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تنبیہ ہمیشہ اس کے سامنے رہتی ہے کہ جو چرواہا اپنا گلہ کسی کے رقبہ کے ارد گرد چراتا ہے، ہر وقت یہ اندیشہ رہتا ہے کہ اس کا گلہ کھیتوں میں جا پڑے۔ یہ اندیشہ متقاضی ہوتا ہے کہ وہ اپنی خواہشوں کی باگ برابر کھینچے رہے۔ اس کو ہر لمحہ یہ خوف ہی دامن گیر رہتا ہے کہ ایک دن اس کو اپنے رب کی عدالت میں کھڑے ہونا اور اپنے ہر قول و فعل کی جواب دہی کرنا ہے۔ ایسے ہی لوگوں کے باب میں ارشاد ہے۔

وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَىٰ ۝ فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوَىٰ ۝ (النّٰزعٰت ۷۹: ۴۰-۴۱)

اور وہ جو اپنے رب کے حضور پیشی سے ڈرا اور جس نے اپنے نفس کو خواہش کی پیروی سے روکا تو اس کا ٹھکانا لاریب جنت ہے۔

اپنی عائلی و خاندانی زندگی میں مشفق ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے آل و اولاد اور اپنے کنبہ و خاندان کو اپنے لئے سرمایۂ فخر و غرور نہیں سمجھتا بلکہ کُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ (تم میں سے ہر شخص چرواہا بنایا گیا ہے اور ہر شخص سے اس کے گلہ کے بارے میں پرسش ہونی ہے) کی تنبیہ کی روشنی میں وہ اپنی اس ذمہ داری کو اچھی طرح سمجھتا ہے کہ جو گلہ اس کی تحویل میں دیا گیا ہے اس کی ایک ایک بھیڑ سے متعلق اس سے پرسش ہونی ہے کہ اس نے اس کی دیکھ بھال کا حق ادا کیا یا نہیں؟ اس احساس ذمہ داری کا قدرتی تقاضا ہے کہ بجائے اس کے کہ اس کو اپنے گلہ کی وسعت پر ناز و فخر ہو برابر فکر اس کو اس بات کی دامن گیر رہتی ہے کہ کوئی بھیڑ آوارہ ہو کر بھیڑیے کی نذر نہ ہو جائے کہ مالک کی طرف سے اس کی بابت پرسش ہو اور وہ ایک نالائق چرواہا ٹھہرے۔ چنانچہ وہ اپنے خاندان کو دیکھ کر اتراتا اور اکڑتا نہیں بلکہ برابر اس فکر میں رہتا ہے کہ ان کی ہدایت و ضلالت سے متعلق اس پر جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں ان کو ادا کرنے کی اس کو توفیق حاصل ہو تاکہ قیامت کے دن اس کو فاسقوں کے سردار کی حیثیت سے اٹھنے کی رسوائی نہ حاصل ہو بلکہ وہ متقیوں کے امام کی حیثیت سے اٹھے۔ اس طرح فکرمند رہنے والوں کے باب میں قرآن نے یہ خبر دی ہے کہ ان کو اور ان کے صالح

متقین کو جنت میں براجمان دیکھ کر جب سوال کرنے والے یہ سوال کریں گے کہ آپ کو یہ مقام کس نیکی کے صلے میں ملا تو جواب دیں گے اِنَّا کُنَّا قَبْلُ فِیْٓ اَهْلِنَا مُشْفِقِیْنَ ۝ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَیْنَا وَ وَقٰىنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ (الطور - ۵۲ : ۲۶ - ۲۷) (ہم اس سے پہلے اہل و عیال کے باب میں بڑے ہی چوکنے رہے ہیں تو اللہ نے ہم پر اپنا فضل فرمایا اور ہمیں عذابِ دوزخ سے محفوظ رکھا) یعنی ہم نے دنیا میں اپنے اہل و عیال کے اندر دنیا کے بدمستوں کی طرح بے فکری کی زندگی نہیں گزاری بلکہ اس ڈر سے کہ ایک دن ان کے خیر و شر سے متعلق ہمیں خدا کے آگے جواب دہی کرنی ہے، ہم نے ان کی دنیا سے زیادہ ان کی عاقبت کی فکر رکھی جس کا صلہ ہم کو یہ ملا ہے۔

قومی و ملی زندگی میں مصلح کا مطلب یہ ہے کہ خوفِ خدا رکھنے والے اس حقیقت سے واقف ہوتے ہیں کہ جو شخص اپنی قوم کے خیر و شر سے بالکل بے تعلق زندگی گزارتا ہے، جب اس کی قوم اپنے اجتماعی فساد کے نتیجے میں خدا کی پکڑ میں آتی ہے تو لازماً وہ لوگ بھی اس عذاب کی زد میں آتے ہیں جو اگرچہ خود مفسد نہ رہے ہوں لیکن انہوں نے مفسدوں کی اصلاح کی کوئی کوشش بھی نہ کی ہو۔ قوموں کے معاملہ میں سنتِ الٰہی یہ ہے کہ ان کی عدالت اسی دنیا میں ہو جاتی ہے اور جب اس عدالت کا وقت آتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے غضب سے صرف وہی لوگ بچتے ہیں جنہوں نے تمام مخالفتوں اور عداوتوں سے بے پروا ہو کر بے خوفِ لامۃ لائم، قوم کو گمراہی سے بچانے کی کوشش کی ہو۔ جو لوگ اپنے مصالح کی خاطر اس طرح کے معاملات کو پرایا جھگڑا سمجھ کر ان سے الگ تھلگ رہتے ہیں وہ اگرچہ خود اپنی نگاہ میں نیک ہوں لیکن ان کا حشر وہی ہوتا ہے جو ایک کشتی کے مسافروں والی تمثیل میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سمجھایا ہے کہ اگر کشتی کے نیچے والے حصہ میں سفر کرنے والے کشتی کے پیندے میں سوراخ کرنا شروع کر دیں اور اوپر والے اس خیال سے ان کے ہاتھ نہ پکڑیں کہ یہ ایک پرایا جھگڑا ہے، اس میں ان کو مداخلت کا کیا حق ہے تو اس کے نتیجے میں کشتی جب ڈوبے گی تو سب کو لے کر ڈوبے گی۔ اوپر والوں کو بھی اور نیچے والوں کو بھی۔

اس سعیٔ اصلاح کی حد قرآن نے یہ مقرر کی ہے کہ اگر اصلاح کرنے والوں کی یہ بات ایک

شخص بھی سننے والا نہ ہو جب بھی انہیں اپنی جدوجہد جاری رکھنی چاہیئے تاکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کا عذر مسموع ہو سکے۔ قرآن میں مسلمین کے ایک گروہ کا ذکر ہوا ہے کہ جب ان کے ساتھیوں میں سے کچھ لوگوں نے حالات سے بددل ہو کر یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ آخر ایسے لوگوں کے پیچھے اپنی اوقات رائیگاں کرنے سے کیا حاصل جو کوئی بات سننے کے لئے تیار ہی نہیں ہیں تو ان کے ذی علم ساتھیوں نے ان کو جواب دیا کہ مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ (الاعراف - ۷ : ۱۶۴) (یہ اس لئے کہ یہ تمہارے رب کے سامنے ہماری طرف سے عذر بن سکے) یعنی ہمیں یہ جدوجہد اس لئے جاری رکھنی چاہیئے کہ ہمارے رب کے سامنے ہمارا عذر اچھی طرح واضح ہو جائے کہ ہمارا جو فرض تھا وہ ہم نے ادا کر دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ قوم کی اصلاح سے متعلق جو ذمہ داری اس کے صالح افراد پر عائد ہوتی ہے وہ کوئی سرسری ذمہ داری نہیں ہے بلکہ یہ جان کی بازی ہے اور اس سے اللہ تعالیٰ کے ہاں بری الذمہ وہی لوگ قرار پائیں گے جو زندگی کے آخری لمحات تک تمام خطرات سے بے پروا ہو کر یہ بازی کھیلیں گے۔

ایک ضروری تنبیہ:۔ آخر میں ایک تنبیہ بھی ضروری ہے وہ یہ کہ اگر انسان خوف اور رجا میں ٹھیک ٹھیک توازن قائم نہ رکھ سکے تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے تعلق کو وہ استوار نہیں رکھ سکتا۔ ضروری ہے کہ یہ دونوں چیزیں نہایت تناسب کے ساتھ اس کے اندر موجود ہوں۔ قرآن نے ان دونوں کو برابر کی نسبت کے ساتھ ملحوظ رکھنے کی ہدایت فرمائی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے: وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا (الاعراف - ۷ : ۵۶) (اور اس کو پکارو بیم و رجا دونوں حالتوں میں) یہ تناسب اس لئے ضروری ہے کہ اگر آدمی پر خوف کا زیادہ غلبہ ہو جائے تو یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ وہ خدا کی رحمت سے مایوس ہو جائے جو درحقیقت کفر ہے۔ یہ مایوسی انسان کو شیطان کے لئے نہایت آسان شکار بنا دیتی ہے۔ وہ اس کو بھٹکا کر دوسرے دروازوں پر ڈال دیتا ہے اور وہ شرک کے جال میں پھنس کر تباہ ہو جاتا ہے۔

اسی طرح اگر اس پر رجائیت کا زیادہ استیلاء ہو جائے تو اس کے وہ اس فتنہ میں مبتلا

باقی صفحہ ۳۳ پر ملاحظہ کیجئے

مراسلہ و مذاکرہ

امین احسن اصلاحی

کیا اسلام صلح و آشتی کا مذہب ہے؟

سوال: اسلام صلح و آشتی کا مذہب ہے۔ اس میں جب یہ بات بھی ناپسندیدہ قرار دی گئی ہے کہ لوگ بغاوت کی راہ اختیار کر کے اپنے حکمرانوں کو بدل ڈالیں تو کیا قباحت واقع ہوگی اگر لوگوں کو اپنے اپنے مسلک و مذہب پر قائم رہنے دیا جائے اور ان سے تعرض کر کے فروعی اختلافات کو ہوا نہ دی جائے؟

جواب: بسا اوقات لوگ ایسے پُرکشش فارمولے ایجاد کر لیتے ہیں کہ جو سنتا ہے ان کو بے سوچے سمجھے قبول کر لیتا ہے حالانکہ وہ بالکل باطل اور گمراہی کی جڑ ہوتے ہیں۔ اسلام صلح و آشتی کا مذہب ہے، یہ بھی اسی طرح کا ایک گمراہ کن فارمولا ہے۔ اسلام کی تعبیر کے باب میں وہی بات قابل قبول ہو سکتی ہے جو قرآن میں بیان ہوئی ہو یا انبیاء علیہم السلام نے فرمائی ہو۔ اس اعتبار سے آپ جانچیں تو اسلام کے صلح و آشتی کا مذہب ہونے کا نظریہ بالکل بے بنیاد نظر آئے گا۔

حضرت ابراہیمؑ کا اپنی قوم سے اعلان برأت قرآن مجید میں ان الفاظ میں بیان ہوا ہے:

إِنَّا بُرَآءُ مِنكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ أَبَدًا حَتَّىٰ تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَحْدَهُ۔ (الممتحنہ: ۴)

ہم بے تعلق ہیں تم سے اور ان سے جن کی تم اللہ کے سوا عبادت کرتے ہو۔ ہم نے تمہارا انکار کیا اور ہمارے اور تمہارے مابین ہمیشہ کے لئے دشمنی اور بیزاری آشکارا ہو گئی تا آنکہ تم ایک اللہ پر ایمان لاؤ۔

ظاہر ہے کہ حضرت ابراہیمؑ سے زیادہ اسلام کا فہم کسے ہو سکتا ہے۔ اگر اسلام واقعی صلح و آشتی کا مذہب ہوتا تو وہ قوم کے سامنے ڈنکے کی چوٹ یہ اعلان کیسے کر سکتے تھے کہ اگر وہ توحید کو نہ مانیں گے تو ان کے اور قوم کے درمیان ہمیشہ کے لئے دشمنی کی دیوار حائل ہو جائے گی۔

نصاریٰ کے بارے میں مشہور ہے کہ ان کا مذہب عفو و رحم کی تعلیم دیتا ہے لیکن بائبل میں آپ کو حضرت مسیح علیہ السلام کا یہ قول ملے گا کہ "میں گھر گھر تلوار چلوانے آیا ہوں"۔ انھوں نے یہودیوں اور فریسیوں کو اس طرح زچ کیا کہ وہ ان کی جان کے دشمن ہو گئے۔ معلوم ہوا کہ حضرت مسیح علیہ السلام

نے بھی اسلام کو صلح و آشتی کا مذہب نہیں سمجھا۔

ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری تاریخ محفوظ ہے۔ آپ آنحضرتؐ کی زندگی کے مکی اور مدنی دونوں ادوار میں مشاہدہ کریں گے کہ آپ نے ہمیشہ حق کا ساتھ دیا۔ آپ نے صلح کی تو حق پر اور اگر جنگ کی تو وہ بھی حق پر قائم رہ کر۔ اسلام کے لئے آپ کو متعدد جنگیں لڑنی پڑیں جن میں رشتہ داروں نے ایک دوسرے پر تلوار چلائی۔ غزوۂ بدر میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کے صاحبزادے قریش کی جانب سے لڑے۔ وہ جب مسلمان ہوئے تو انہوں نے اپنے والد ماجد سے بیان کیا کہ ابا جان جنگ کے دوران ایک موقع پر آپ میری تلوار کی زد میں آ گئے تھے لیکن میں نے آپ کا لحاظ کیا اور آپ پر تلوار نہیں اٹھائی۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا کہ برخوردار، اگر تم میری تلوار کے نیچے آ گئے ہوتے تو میں ہرگز رعایت نہ کرتا اور تمہاری گردن اڑا دیتا۔ اگر اسلام صلح و آشتی کی تعلیم دیتا تو ان صلحاء و ابرار کا وہ عمل نہ ہوتا جس کے متعدد نظائر ہمیں تاریخ میں ملتے ہیں۔

اس زمانے میں بعض لوگوں نے سورہ الکافرون کی آیت لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ (تمہارے لئے تمہارا دین ہے اور میرے لئے میرا دین) اور اس مضمون کی بعض دوسری آیات سے استدلال کرتے ہوئے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اسلام رواداری کا درس دیتا ہے اور چاہتا ہے کہ لوگ اپنے اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے باہم صلح و محبت سے رہیں۔ یہ نتیجہ انبیاء کرام کی جدوجہد کی نفی کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کلمات رواداری کے نہیں بلکہ قطع تعلق اور اعلان برأت کے ہیں جس پر ان آیات کا سیاق و سباق شاہد ہے۔ ہم اپنی تفسیر میں اس مسئلہ کی وضاحت کر چکے ہیں۔

اسلام امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تعلیم دیتا ہے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی اپنے ماحول میں لوگوں کو نیکی اور بھلائی کی دعوت برابر دیتا رہے اور حتی المقدور برائی کو مٹانے کی کوشش کرے۔ اگر آپ اس بات کی استطاعت رکھتے ہیں کہ برائی کو طاقت کے زور سے بدل دیں تو یہ اعلیٰ ترین درجۂ ایمان ہے۔ اگر آپ اس پر قادر نہیں تو زبان سے اصلاح کی کوشش کریں۔ اگر اس کی بھی ہمت نہ رکھتے ہوں تو ادنیٰ ترین درجۂ ایمان یہ ہے کہ برائی کو برائی سمجھیں، اس سے ناگواری محسوس کریں، اپنے آپ کو اس سے الگ رکھیں، اس سے کوئی نفع حاصل نہ کریں، اس کے حاملین کی خوشامد نہ کریں، خود ایمانداری کی روش اختیار کریں، اپنے دہنے بائیں، آگے پیچھے، ہر جگہ نیکی کا چرچا کریں۔ خواہ اسے کوئی سنے یا نہ سنے اور مانے یا نہ مانے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے مشن کو اپنا کر آپ اپنے ماحول

میں خاموش تماشائی کا کردار ادا نہیں کر سکتے۔ ایک مسلسل کشمکش آپ کا مقدر بن جائے گی۔ صلح و آشتی کا مسلک گاندھی جی کے پیروکاروں کا تو ہو سکتا ہے حقیقی مسلمانوں کا نہیں ہو سکتا۔

جہاں تک بغاوت کا تعلق ہے اسلام نے یہ پسند نہیں کیا کہ آپ بغیر استطاعت کے انقلاب برپا کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوں اور ملک میں خون خرابہ کریں۔ کسی کام کو کامیابی کے ساتھ کرنے کے لئے آپ کے اندر اس کی استطاعت ہونی چاہئے۔ انقلاب لانے کے لئے خالی نعرہ لگانا کافی نہیں ہوتا بلکہ اس کے لئے زمین ہموار کی جاتی ہے۔ دلوں کو بدلا جاتا ہے۔ لوگوں کی تربیت و اصلاح کی جاتی ہے جب قوم کا معتد بہ حصہ آپ کا ہمنوا ہو جاتا ہے تو وہ طاقت فراہم ہو جاتی ہے جس سے حالات میں انقلاب رونما ہوتا ہے۔ اس وقت قوم کو کسی خارجی قوت کی ضرورت بھی نہیں رہ جاتی۔ ان لوازمات کو پس پشت ڈال کر آپ خدائی فوجدار بننے کی کوشش کریں گے تو اسی انجام سے دوچار ہوں گے جو اس دور کی بعض اسلامی تحریکوں کا ہوا ہے۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے جو سیاسی انقلاب برپا کرنے کی کوشش کی تھی اس کو بھی بیشتر لوگوں نے نہیں سمجھا۔ مخالفین کے ساتھ مذاکرات کے آخری مرحلے میں جا کر انہوں نے جو یہ شرائط پیش کیں کہ انہیں امیر یزید کے پاس جانے دیا جائے یا سرحدوں کی طرف نکل جانے کی اجازت دی جائے یا واپس مکہ کو لوٹنے دیا جائے، ان شرائط سے انہوں نے اپنا اٹھایا ہوا قدم واپس لے لیا۔ کربلا کا محل وقوع بتاتا ہے کہ امیر یزید کے پاس لے جانے کی شرط مان لی گئی اور قافلہ کوفہ جانے کے بجائے دمشق کو چل پڑا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بعض اصحاب الاغراض یہ نہیں چاہتے تھے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ امیر یزید کے پاس جائیں۔ ان شریر لوگوں نے چاہا کہ جنگ ہو۔ جنگ جب ہو جائے تو پھر یہ معلوم نہیں ہوتا کہ تلوار کس کس پر چمک جائے۔ چنانچہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ بھی اس جنگ میں مظلومانہ شہید ہو گئے۔

واقعہ یہ ہے کہ ہمارے حکمران جیسے بھی ہوں، اگر ہمارے پاس اس قدر طاقت نہ ہو کہ ہم ان کو تبدیل کر سکیں تو بہر حال ہمیں وفاداری کے ساتھ ان کے زیر اقتدار کام کرنا ہو گا لیکن یہ ضروری ہے کہ ہم ان کی برائی میں شریک نہ ہوں، ان کی کسی غلط بات پہ آمین نہ کہیں، ان سے نفع اندوزی کی خواہش نہ رکھیں، حق کے بارے میں ان کو نصیحت کر سکنے کی پوزیشن میں ہوں تو ان کو نصیحت کرتے رہیں اور اگر اس کی استطاعت نہ رکھتے ہوں تو دعا کرتے رہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمارے ملک اور ہماری قوم کے بیڑے کو سلامت رکھے۔

(ترتیب : ماجد خاور)